جاوید احمد غامدی

علم کی بنیاد

[۳]

علم کی تقسیم اگر اُس کے درجات کے لحاظ سے کی جائے تو وہ اضطراری ہو گا یا استدلالی۔ پہلے درجے میں ذات باری اور نفس اور اُس کے خارج کا علم ہے۔ دوسرے درجے میں صفات باری اور نفس اور اُس کے خارج کے احوال کا علم ہے۔ اِس دوسری قسم کے لیے بنائے استدلال ضروری ہے۔ یہ بنائے استدلال الہامات فطرت بھی ہو سکتے ہیں جنھیں ہم اضطراری علم سے تعبیر کرتے ہیں؛ فکر و استنباط کے نتائج بھی ہو سکتے ہیں جو معلوم کے درجے تک پہنچ گئے ہوں اور ماضی کا علم بھی جو تعلیم و تعلم کے ذریعے سے منتقل ہوا ہو۔ یہ سب چیزیں، اگر غور کیجیے تو وہی ہیں جو پہلے سے ہمارا یقین و اذعان بن چکی ہوتی ہیں۔ اِسی طرح بنا اور مبنی میں لازم و ملزوم کی نسبت ضروری ہے، اِس طرح کہ اگر بنا کو مانا جائے تو جو اُس پر مبنی ہے، اُس کو ماننا بھی لازم ہو جائے۔ پھر یہ بنائے استدلال کسی اصل کی فرع ہو گی یا فرع کی اصل اور دونوں میں لزوم متحقق ہو گا۔ امام فراہی لکھتے ہیں کہ اِس سے استدلال کی جو اقسام وجود میں آئیں گی، وہ یہ تین ہیں:

اولاً، فرع سے اصل پر استدلال، اِس لیے کہ فرع ہے تو اصل کو بھی لازماً ہونا چاہیے۔

ثانیاً، اصل سے فرع پر استدلال، اِس لیے کہ اصل فرع کو متضمن ہوتی ہے، لہٰذا اصل پر غور کیا جائے تو وہ جن فروع کو متضمن ہے، اُن سب پر دلالت کرے گی۔ اصل کو ہم اِسی بنا پر اصل اور فرع کو فرع کہتے ہیں۔

ثالثاً، فرع سے دوسرے فروع پر استدلال، جس کا ذریعہ اصل کا ثبوت ہو گا۔ چنانچہ فرع پہلے اپنی اصل پر دلالت کرے گی، پھر اصل دوسرے تمام فروع تک پہنچا دے گی۔

انسان اپنے تمام افکار و اعمال میں فطری طور پر استدلال کے یہی طریقے استعمال کرتا ہے۔ اِن میں غلطی اُسی وقت ہوتی ہے، جب وہ اصل اور فرع کے مابین نسبت کے بارے میں فکر و نظر سے اعراض کر لیتا ہے۔

[۲۰۱۲ء]

جاوید احمد غامدی

ہماری دعوت

[جناب جاوید احمد غامدی کا انٹرنیٹ پر خطاب]

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ! وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدٍ الْاَمِیْنِ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ! بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ! رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَ یَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ وَ احْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ.

خواتین وحضرات، میں نے ہمیشہ یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ دین درحقیقت اللہ تعالیٰ کی وہ ہدایت ہے جو اس نے سب سے پہلے انسان کی فطرت میں ودیعت فرمائی اور پھر اپنے نبیوں کے ذریعے سے اس کی دعوت برپا کی۔ قرآن مجید بھی ہمیں بتاتا ہے اور تورات وانجیل بھی اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ اللہ کے پیغمبر اسی لیے بھیجے گئے کہ وہ انسان کی فطرت میں ودیعت اس پیغام کی تذکیر کریں، اس کے لیے دلوں کو آمادہ کریں، اسے دماغوں میں اتاریں، اس سے متعلق اگر کوئی اشکال ہو تو اس کا جواب دیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اجمال کے ساتھ ودیعت فرمایا ہے، اس کی تفصیل کریں۔

اس لحاظ سے اگر آپ دیکھیں تو دین کی دعوت کو ہم دو زمانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: ایک زمانہ وہ ہے جسے زمانۂ رسالت کہنا چاہیے اور دوسرا زمانہ مابعد رسالت ہے۔ زمانۂ رسالت میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر بھیجتے تھے۔ اس وقت اصلاً یہ دعوت ان پیغمبروں ہی کے ذریعے سے برپا ہوتی تھی۔ پیغمبروں کا معاملہ یہ تھا کہ ان کی طرف آسمان سے وحی آتی تھی۔ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں یہ دعوت برپا کرتے تھے۔ اگر کسی جگہ پر ادنیٰ درجے کی بھی لغزش ہوتی تھی تو اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح فرما دیتے تھے اور اگر اس دعوت میں شیطانی قوتوں کی طرف سے دراندازی کا امکان ہوتا تھا تو اس کو بھی روکنے کا پورا اہتمام کر دیتے تھے۔ اس سلسلے کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اُن

کے ساتھ زمانۂ رسالت ختم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست دعوت کے نزول کو منقطع کر دیا گیا اور قیامت تک کے لیے منقطع کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن مجید نازل ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ کوئی نئی کتاب نہیں آئے گی۔ اب اس دعوت کو عام انسانوں کو لے کر اٹھنا ہے۔ چنانچہ اگر آپ قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ توبہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری دینونت کی سورہ ہے — یعنی جس میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے جو جزا اور سزا عالمی سطح پر برپا کی گئی، اس کی سرگذشت بیان ہوئی ہے — اس سورہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اب زمانۂ رسالت کے ختم ہونے کے بعد لوگوں کو کیا کرنا ہے؟ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے: 'وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً'۔ یعنی سارے مسلمان تو اس کام کے لیے نہیں اٹھ سکتے۔ — کسی کو سائنس دان بننا ہے، کسی کو ڈاکٹر بننا ہے، کسی کو انجینئر بننا ہے، کسی کو کاروبار کرنا ہے، کسی کو منڈی میں بیٹھنا ہے، کسی کو دفتر میں خدمت انجام دینی ہے، کسی کو کھیتوں میں جا کر کام کرنا ہے۔ انسانی زندگی کی تقسیم اسی طرح کی ہے — تو ارشاد فرمایا ہے کہ یہ سب لوگوں کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ اس کام کے لیے نکل کھڑے ہوں 'فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ' یعنی ان کے ہر گروہ میں سے ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ لوگ نکلیں — دو، چار، پانچ، دس — وہ نکل کر کیا کریں؟ 'لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ'*، وہ اللہ کے دین کی سچی بصیرت پیدا کریں یعنی دین کا صحیح علم حاصل کریں، دین کو سمجھیں جس طرح کہ اس کو سمجھنے کا حق ہے اور پھر اپنی قوموں کو انذار کریں۔ یہ قرآن کریم نے وہی لفظ استعمال کیا ہے جو وہ پیغمبروں کے معاملے میں استعمال کرتا ہے۔

قرآن مجید کا یہی ارشاد ہے جس نے ہماری امت میں علما کا منصب پیدا کیا ہے، یعنی کچھ لوگ جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں کا انتخاب کرتے ہیں، اسی طریقے سے اس شعبے کو بھی اپنی زندگی کا مقصد بنائیں۔ کچھ لوگ، یعنی ایسے لوگ جو اس کی فطری صلاحیت رکھتے ہوں، اس کا فطری ذوق رکھتے ہوں، اس کا فطری رجحان رکھتے ہوں، وہ اٹھیں اور اٹھ کر دین کی سچی بصیرت پیدا کریں۔ اور جب وہ دین کی سچی بصیرت پیدا کر لیں تو وہی کام کریں جو اللہ کے پیغمبر کرتے تھے۔ چنانچہ ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہماری امت میں یہ روایت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قائم ہو گئی۔ صحابۂ کرام میں سے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے دین کی سچی بصیرت دی تھی، انھوں نے یہ کام کیا۔ تابعین نے یہ کام کیا، تبع تابعین نے یہ کام کیا۔ اس وقت قرآن مجید موجود تھا۔ وہ قرآن مجید جس کے بارے میں خود اس نے کہا تھا کہ جو بھی خدا سے ڈرتا ہے، وہ قرآن کے ذریعے سے تذکیر کا محتاج ہے۔ اسے تذکیر کرو، اسے

* التوبہ ۹: ۱۲۲۔

نصیحت کرو، اس تک دعوت پہنچاؤ۔قرآن ان کے لیے گویا دعوت کی کتاب تھی۔ وہ اس کو لے کر نکلے اور انھوں نے سارے عالم تک اس دعوت کو پہنچانے کے لیے جدوجہد کی۔ وہ ہمارا وہ دور تھا کہ جس کے بارے میں خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: 'خیر القرون قرني، ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم'* (میرا زمانہ بہترین زمانہ ہے، پھر اس کے بعد، پھر اس کے بعد)۔ اس زمانے میں دین کی خالص دعوت برپا ہوئی۔ دین کا پیغام لوگوں تک پہنچا اور جس طرح رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حجت تمام کر دی تھی، انھوں نے بھی اسی طریقے سے اس پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کا عمل شروع کیا۔

اس زمانے کے بعد بتدریج وہ دور آ گیا جس میں اس دعوت کو کچھ آفات لاحق ہو گئیں۔ اگر آپ اپنی علمی تاریخ اور دعوتی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ یہ دو طرح کی آفات ہیں۔ پہلی آفت اس دعوت کو یہ لاحق ہوئی کہ قرآن مجید کو جو حیثیت دین میں دی گئی، جس کو خود قرآن نے بیان کیا، جس کی طرف رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری دعوتی زندگی میں توجہ دلائی تھی، جس کو صحابۂ کرام نے اسی حیثیت سے پیش کیا تھا، قرآن کی وہ حیثیت قائم نہیں رہی۔ پہلا حادثہ یہ ہوا۔

قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے۔ قرآن مجید ہماری آنکھوں کا سرور ہے۔ قرآن مجید کے ذریعے سے ہم ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی طرف سب سے پہلے نگاہ کرنی چاہیے۔ اگر ہم نے کوئی قانون اخذ کرنا ہے، کوئی حکم اخذ کرنا ہے تو قرآن کو دیکھنا چاہیے۔ اس میں تو کوئی اضمحلال نہیں ہوا، لیکن قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ حکم ہے — یعنی اس کی حیثیت ایک فیصلہ کن سند کی ہے۔ جب دین کے معاملے میں کوئی چیز پیدا ہو گی تو قرآن آخری فیصلہ سنائے گا۔ وہ ہر چیز پر حکومت کرے گا۔ خواہ بخاری و مسلم ہوں، خواہ بوحنیفہ و شافعی ہوں، خواہ اشعری و ماتریدی ہوں، ہر ایک پر قرآن کی حکومت قائم ہو گی — یہ حیثیت مجروح ہونا شروع ہو گئی۔ اگر آپ اس کا بھی استقصا کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ چار چیزیں ہیں جو اس حیثیت کو مجروح کرنے کا باعث بنیں۔

ان میں سے ایک چیز یہ تھی کہ پہلی صدی کے خاتمے تک پہنچتے پہنچتے قرآن مجید کی بہت سی قراءتیں رائج ہو گئیں۔ سیکڑوں کی تعداد میں۔ یہ تو بہت بعد میں ان میں سے لوگوں نے انتخاب کرنا شروع کیا۔ پھر کچھ پچیس قراءتوں کا انتخاب کیا گیا۔ پھر دس کا کیا گیا، پھر سات کا کیا گیا۔ یہ قراءتوں کا تعدد قرآن مجید کی حاکمیت پر اثر انداز ہونا شروع ہوا۔ یعنی آپ یہ کہتے ہیں کہ قرآن یہ کہہ رہا ہے، کوئی دوسرا آدمی کہتا ہے کہ قرآن کی یہ آیت اس طرح بھی پڑھی گئی ہے اور اس طرح قرآن مجید کی وہ حجت جو لوگوں پر قائم ہونی تھی، وہ بتدریج مجروح ہونا شروع ہوئی۔

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۳/۳۲۰۔

دوسرا معاملہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کے بارے میں متکلمین نے یہ تصور دینا شروع کیا کہ یہ چونکہ الفاظ ہی میں ہے اور الفاظ کی اپنے معنی پر دلالت قطعی نہیں ہوتی، لہٰذا ہمارے لیے اصلی حجت عقلی برہانیات ہیں۔ جب ہم اپنے علم و عقل سے کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں تو حکم کی حیثیت اس کو حاصل ہوتی ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ سے جو مطلب سمجھا جا رہا ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ وہی ہو جو ہم سمجھ رہے ہیں۔ ہم حتمی طور پر، قطعی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کا منشا یہی ہے۔

تیسری چیز یہ ہوئی کہ خود قرآن مجید میں چونکہ یہ بیان ہوا ہے کہ اس کی آیات محکمات بھی ہیں اور متشابہات بھی ہیں تو متشابہات کے بارے میں یہ تصور قائم کیا گیا کہ یہ متعین نہیں ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ کون سی آیت محکم ہے اور کون سی آیت متشابہ ہے۔ اور پھر متشابہ آیات کے معنی بھی ہم نہیں جانتے۔ نتیجہ کیا نکلا؟ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر آیت کے بارے میں اس بحث کا دروازہ کھل گیا کہ اگر وہ متشابہ ہے تو پھر ظاہر ہے کہ وہ اپنی حکومت بھی دوسری چیزوں پر قائم نہیں رکھ سکے گی۔

اس سلسلے کی آخری چیز یہ ہوئی کہ حدیث کے بارے میں یہ خیال کیا گیا کہ وہ قرآن پر حکومت کرے گی۔ قرآن اس کی روشنی میں سمجھا جائے گا۔ جو کچھ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے، اگر اس سے متعلق کوئی حدیث سامنے آ جائے گی تو ہم حدیث سے حاصل ہونے والے مفہوم کو ترجیح دیں گے۔

یہ چار چیزیں ہیں جو آفت بن کر نازل ہوئیں اور قرآن مجید کے بارے میں اور اللہ کی سب کتابوں کے بارے میں جو چیز خود قرآن نے بیان کر دی تھی کہ وہ نازل ہی اس لیے کی گئی تھیں کہ وہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کریں اور اپنے بارے میں یہ کہتا ہے کہ یہ میزان ہے، یہ فرقان ہے۔ یہ وہ ترازو ہے جس پر ہر چیز کو تولا جانا ہے۔ یہ حق و باطل کی کسوٹی ہے، جس پر ہر چیز کو پرکھا جانا ہے۔ یہ حیثیت مجروح ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب کی حیثیت سے مانا گیا، مقدس کتاب کی حیثیت سے مانا گیا، جزدانوں میں لپیٹا گیا، طاقوں پر رکھا گیا، مسجدوں میں سجایا گیا۔ قرآن مجید کی طرف رجوع بھی کیا گیا۔ اس سے استشہاد بھی کیا گیا۔ اس کو قانون کے اولین ماخذ کی حیثیت سے بھی ترجیح دی گئی، لیکن حکومت کس کی ہو گی، آخری فیصلہ کس کا ہو گا، یہ چیز قرآن مجید کے معاملے میں اس درجے میں نہ رہی جس درجے میں قرآن نے اس کو قائم کیا تھا، جس درجے میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قائم تھی، جس درجے میں یہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں قائم تھی۔

دین کی دعوت کو دوسری آفت یہ لاحق ہوئی کہ جب مسلمانوں نے اپنی ایک عظیم سلطنت قائم کر لی تو بہت سے

نئے معاملات درپیش ہوئے۔ جب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت برپا کی تھی تو بہت تھوڑے سے لوگ تھے جو آپ کے ساتھ تھے۔ مدینے میں ریاست قائم ہوئی تو چند سو کی تعداد میں صحابۂ کرام تھے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب پورے کے پورے جزیرہ نماے عرب پر اپنی حکومت قائم کر لی، اس وقت بھی یہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے متجاوز نہیں ہوئے تھے۔ لیکن جب پورا عجم مفتوح ہو گیا، جو آج کی سلطنتیں ہیں، وہ اس بڑی سلطنت کا حصہ بن گئیں تو بہت بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے۔ چنانچہ اس وقت یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اتنے بڑے پیمانے پر جو لوگ مسلمان ہوئے ہیں، ان کو کیا مسائل اور سوالات درپیش ہیں؟ وہ سوالات سیاست سے بھی پیدا ہوئے، وہ معیشت سے بھی پیدا ہوئے، وہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یعنی عبادات سے بھی پیدا ہوئے۔ یہ بڑی فطری چیز تھی۔ اس کے بارے میں یہ رہنمائی موجود تھی کہ اگر کوئی چیز قرآن مجید میں نہیں ملتی، اگر کوئی چیز سنت میں نہیں ملتی تو اس میں ہم اجتہاد کریں گے، چنانچہ اجتہاد کیا گیا۔ بڑے بڑے مجتہدین پیدا ہوئے ـــــ اور یہ ایک ناگزیر ضرورت تھی، آج بھی ہے، اس وقت بھی تھی، ہمیشہ رہے گی۔ یہ اجتہاد ہوا اور پانی کی طرح ہماری ضرورت ہے ـــــ لیکن اس اجتہاد کے نتیجے میں جو فقہ مرتب ہوئی، وہ انسانی کام تھا۔ انسانی کام کو انسانی کام کے درجے میں رہنا چاہیے تھا۔ ایسا نہیں ہوا اور بتدریج یہ صورت حال پیدا ہو گئی کہ بحیثیت مجموعی دین کی پوری تصویر کے ساتھ فقہ کی آمیزش ہو گئی۔ یہ پہلی آمیزش تھی۔

دوسری آمیزش یہ ہوئی کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا یونان کے علوم ترجمہ ہو کر مسلمانوں میں پھیلنا شروع ہو گئے۔ مسلمانوں میں بہت سے غیر معمولی طور پر ذہین لوگ اس سے متاثر ہوئے۔ عباسیوں کے ابتدائی زمانے میں جب عجم سے واسطہ پڑا تو عجم میں بھی فلسفے کی ایک روایت رہی تھی۔ اس سے بھی لوگ متاثر ہوئے۔ یونانی فلسفہ، عجمی فلسفہ اور کسی حد تک ہندی اور مصری فلسفہ، اس کی بہت سی چیزیں لوگوں کو بڑی پرکشش محسوس ہوئیں اور انھوں نے خیال کیا کہ یہ شاید ہمارے مسئلے کا حل ہیں، اور جب آدمی کسی چیز سے متاثر ہو جاتا ہے اور ایک جانب وہ کسی دین کو بھی مانتا ہے تو اس میں آپ سے آپ یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا ان دونوں میں کوئی موافقت کی صورت تلاش کی جا سکتی ہے؟ چنانچہ موافقت کی جو صورتیں تلاش کی گئیں، ان فلسفیانہ مباحث کو دین میں وہیں سے داخل ہونے کا موقع ملا۔ جو بڑے بڑے فلسفی مسلمانوں کے اندر پیدا ہوئے، انھوں نے یہ کوشش کی۔ جو کچھ انھوں نے یونان سے اخذ کیا، جو کچھ انھوں نے مصر کی روایت سے اخذ کیا، جو کچھ انھوں نے ہندوستان کی روایت سے اخذ کیا، اس کو انھوں نے دینی فکر کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔ یہ دوسری آمیزش تھی۔

پھر اس کے بعد مسلمانوں میں بعض ایسے لوگ پیدا ہوئے کہ جنھوں نے یہ خیال کیا کہ اب ہمارے لیے فلسفے کا

اسلوب استعمال کرنا ضروری ہے۔ دین مجروح ہو رہا ہے، لہٰذا ہمیں استدلال کے ان طریقوں کو استعمال کر کے جو منطق اور فلسفے نے رائج کر لیے ہیں، دین کے عقائد کا دفاع کرنا ہے۔ یہ وہ چیز تھی کہ جس نے ہمارے ہاں علم الکلام کو وجود بخشا اور اس طریقے سے ایک تیسری آمیزش وجود میں آئی۔

پھر اس کے بعد وہ دور آ گیا کہ جس میں صوفیانہ مذاہب مسلمانوں میں پھیلنا شروع ہوئے۔ میں یہاں چند لفظوں میں یہ واضح کر دوں کہ مذاہب کی دو اقسام ہمیشہ سے رہی ہیں: ایک الہامی مذاہب، یعنی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجے۔ ان کے بارے میں تو مذاہب کا لفظ بولنا بھی موزوں نہیں ہے، اس لیے کہ خود قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ وہ درحقیقت ایک ہی مذہب، ایک ہی دین تھا اور وہ اسلام ہی تھا۔ سیدنا آدم علیہ السلام بھی اسی کو لے کر آئے، سیدنا نوح علیہ السلام بھی اسی کو لے کر آئے۔ ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام بھی اسی کو لے کر آئے۔ تمام پیغمبروں نے اسی دین کو پیش کیا۔ سورۂ شوریٰ میں ارشاد ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ. (۴۲:۱۳)

''اُس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم اُس نے نوح کو دیا، اور جس کی وحی اب ہم نے تمھاری طرف کی ہے اور جس کی ہدایت ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو فرمائی، اِس تاکید کے ساتھ کہ (اپنی زندگی میں) اِس دین کو قائم رکھو اور اِس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔''

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اے پیغمبر، ہم نے آپ کو وہی دین دیا ہے جو ہم نے ان سب پیغمبروں کو دیا تھا۔ تو اسلام اللہ کا دین، جو پیغمبروں کے ذریعے سے ملا تھا۔ اسی دین کو، جس طریقے سے وہ دیا گیا، اسی طریقے سے لوگوں تک پہنچنا تھا۔ لوگوں کے پاس اس کو جانا تھا اور لوگوں نے اس کو اخذ کرنا تھا، اس کو قبول کرنا تھا۔ یہ الہامی دین ہے۔ اس کے برعکس فلسفیانہ مذاہب وہ تھے کہ جن میں فلسفی مزاج لوگوں نے یہ کوشش کی کہ وہ خدا سے براہ راست رابطے کے راستے ڈھونڈیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال بدھ مت ہے۔ ہندومت بھی کم و بیش اسی طرح کی چیز ہے۔ تو صوفیانہ مذاہب سے مسلمان پہلی مرتبہ متعارف ہوئے، اور جب متعارف ہوئے تو صوفیانہ مذاہب کے کچھ بنیادی تصورات ہیں، کچھ اس کے اندر کشش کی چیزیں ہیں، کچھ ایسے مقامات ہیں جو انسان کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ انسان کی نفسیات کے بعض لوازم ہیں جو اس کو متاثر کرتے ہیں۔ ان سب چیزوں نے مل کر ایک ایسی فضا پیدا کی کہ بہت سے ذہین عناصر نے یہ آمیزش بھی دین میں داخل کی۔ تصوف درحقیقت اسی کا نام ہے۔ اِس آمیزش

سے ہمارے بڑے جلیل القدر لوگ متاثر ہوئے اور اس کے نتیجے میں دین کی دعوت تصوف کی آمیزش کے ساتھ سامنے آنی شروع ہوگئی۔ اس کا ابتدائی غیر معمولی نمونہ امام غزالی کی شخصیت ہے۔ ان کی کتاب ''احیاء علوم الدین'' ہماری دعوتی، علمی اور فکری تاریخ کا غیر معمولی مرقع ہے۔ ''احیاء علوم الدین'' کے بارے میں ایک زمانے میں لوگ کہتے تھے کہ اگر ساری کتابیں ختم ہو جائیں تو یہی ایک کافی ہے کہ جس کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے۔ اس کتاب کو آپ پڑھیے تو جن آمیزشوں کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ ان سب کے ساتھ دین کو ملا کر پیش کرتی ہے، یعنی اس میں اشاعرہ کا علم کلام بھی ہے، اس میں فلسفیانہ مذاہب کا پرتو بھی ہے، اس میں صوفیانہ مذاہب کو ایک حقیقت کے طور پر اختیار کر لیا گیا ہے، یہاں تک کہ ''المنقذ من الضلال'' میں، جو کہ امام غزالی کی سرگذشت ہے، انھوں نے خود اس کو بیان کر دیا کہ میں نے جب حقیقت کو تلاش کرنا چاہا تو میں مختلف دروازوں پر گیا اور میں نے دستک دی، لیکن کہیں سے دل کا اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ آخر میں وہ صوفیا سے ملے۔ چنانچہ ان کی پوری فکر پر آپ اس کو سایہ فگن دیکھتے ہیں۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جس کتاب نے صدیوں تک مسلمانوں کے ذہنوں پر حکومت کی ہے اور اس وقت بھی کر رہی ہے۔ یہ اسی کے مباحث تھے کہ جن کو دین کی صحیح ترین تعبیر سمجھا گیا اور پھر خود امام غزالی نے اسی کا خلاصہ ''کیمیائے سعادت'' کی صورت میں کیا۔ یہ ایک روایت ہے جو وہاں سے قائم ہوئی تھی۔

اسی کا منتہائے کمال ''شاہ ولی اللہ'' کی شخصیت ہے۔ انھوں نے بھی یہی کوشش کی کہ ان تمام آمیزشوں کی صلح کرا دیں اور ان کو ایسی صورت میں پیش کر دیں کہ جس میں فقہ بھی شامل رہے، اس میں فلسفہ بھی شامل رہے، اس میں تصوف بھی شامل رہے اور ان سب آمیزشوں کے ساتھ دین کو اس طرح پیش کیا جائے کہ جس میں یہ سارا فکر اس کے پس منظر میں جھلکتا ہو۔ چنانچہ ان کی ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں اور ان کی دوسری تصنیفات میں آپ اس رنگ کو دیکھ سکتے ہیں۔

اس کی ایک غیر معمولی صورت وہ ہے جو علامہ اقبال کی "Reconstruction of Religious thought in Islam" میں نظر آتی ہے۔ آپ اس کے آخری خطبے کو پڑھیے، وہ خود یہ بیان کرتے ہیں کہ مذہبی فکر تین ادوار سے گزرتا ہے: اس میں پہلا دور ایمان کا ہوتا ہے۔ محض ایمان، یعنی ایک دعوت دی گئی، آپ نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ اس میں جوش ہوتا ہے، جذبہ ہوتا ہے، قوت عمل ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد فکر کا دور آتا ہے، اور پھر عرفان کا دور آتا ہے۔ درحقیقت یہ فکر اور عرفان کیا چیزیں ہیں؟ یہ وہی چیزیں ہیں جو ان آمیزشوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ "Reconstruction of Religious thought in Islam" بھی درحقیقت اسی دور کی چیز ہے۔ میں اس پورے دور کو ایک دور سے تعبیر کرتا ہوں۔

ان دونوں آفتوں کی تفصیل سننے کے بعد یہ خیال نہ کیجیے کہ ان کے لاحق ہو جانے کے بعد باقی سب کے سب لوگ سو گئے۔ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم رہا اس امت پر کہ اس میں وقتاً فوقتاً ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے کہ جو دین کو بے آمیز صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یعنی انھوں نے بڑی غیر معمولی جدوجہد کی اور اس سارے نقطۂ نظر کو چیلنج کیا، اس کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کی، لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ دین ہماری چیز نہیں ہے، یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے جسے ہم تراش رہے ہیں، یہ کوئی فکر نہیں ہے جو ہمارے اندر سے پیدا ہو رہا ہے، اس کے مراحل ہمارے ہاں نہیں گزرتے، یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس میں فکر و نظر کا ارتقا ہے جس سے چیزیں متعین ہو کر سامنے آتی ہیں۔ یہ در حقیقت پیغمبروں کی دعوت ہے، یہ خدا کی دعوت ہے۔ اس میں اصل چیز یہی ہے کہ اس کو ہر طرح کی آمیزش سے پاک کر کے پیش کیا جائے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی چیز کو واضح کیا تھا، جب یہ کہا تھا کہ یاد رکھو! دین میں کوئی نئی چیز داخل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ بدعت ہوگی اور ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے اور ہر گمراہی کا آخری انجام جہنم ہے*۔ یہ آپ کے علم میں ہوگا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے جو ہمارے خطبات جمعہ کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس جملے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ کی تھی لوگوں کو اور یہ بتایا تھا کہ ایسا نہ ہونے دینا۔ چنانچہ اس علم کو لے کر بہت سے لوگ اترتے رہے اور ہماری امت میں بڑی غیر معمولی شخصیات پیدا ہوئیں جنھوں نے یہ کوشش کی کہ دین کو بے آمیز، بے کم و کاست، خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر پیش کیا جائے۔ بہت سی شخصیات پیدا ہوئیں۔ ان میں جس طرح امام غزالی کی شخصیت بڑی غیر معمولی ہے، اسی طرح امام ابن تیمیہ کی شخصیت اس دوسرے مکتبِ فکر میں غیر معمولی ہے۔ ان کا غزالی پر بڑا مشہور تبصرہ ہے کہ ''وہ فلسفے کے پیٹ میں داخل ہوئے اور پھر کبھی باہر نہیں نکل سکے''۔ انھوں نے اپنی طرف سے اس کی کوشش کی کہ دین کو اصل قرآن و سنت کی بنیاد پر، خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر پیش کیا جائے۔ میں نے نمایاں شخصیت کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا اور انھی کے شاگرد ابن قیم کو بھی یہی غیر معمولی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی شخصیات ہیں۔ ہمارے زمانے میں بھی یہ جدوجہد اسی طرح جاری رہی اور بہت غیر معمولی شخصیات دونوں نقطہ ہاے نظر کی نمائندگی کرنے والی پیدا ہوتی رہیں۔ اس پچھلے دو سو سال میں جب مسلمان انحطاط میں مبتلا ہوئے ہیں، اس وقت بھی دونوں مکاتب فکر کی غیر معمولی شخصیات آپ کو مل جاتی ہیں۔

---

* ابوداؤد، رقم ۴۶۰۷۔

میں نے جب سے شعور کی آنکھ کھولی اور دین کا مطالعہ کرنا شروع کیا تو میرا اپنا رجحان پہلے مرحلے میں پہلے مکتب فکر کے ساتھ تھا۔ میرا چونکہ اپنا ذہنی پس منظر فلسفے، تاریخ اور تصوف کا تھا، اس لیے میں یہ سمجھتا تھا کہ وہی طرز فکر صحیح ہے۔ دین فی الواقع ایمان، فکر اور عرفان کے مراحل سے گزرتا ہے اور اسی موقع پر اس کی صحیح تعبیر سامنے آتی ہے۔ لیکن بتدریج یہ حقیقت مجھ پر واضح ہوتی چلی گئی کہ یہ نقطۂ نظر دین کے معاملے میں درست نہیں ہے۔ مجھے اگر کوئی اپنا فلسفہ پیش کرنا ہے، اپنا کوئی فکر پیش کرنا ہے تو وہ مجھے اپنی ہی طرف سے پیش کرنا ہے۔ خدا کی طرف نسبت دے کر وہی بات کہی جا سکتی ہے جو اس کے پیغمبروں کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہے۔ یہ حقیقت ہے جس نے میری زندگی کا رخ تبدیل کیا اور اس کو محکم تر کر دیا۔

میرے جلیل القدر استاذ امام امین احسن اصلاحی کے ساتھ میری ملاقات نے، ان کی ملاقات نے، ان کی فکر نے، ان کی تصنیفات نے، ان کی صحبتوں نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ دین کی دعوت اگر برپا کی جائے گی تو یہ ضروری ہے کہ اس کو قرآن مجید کی محکم اساس پر پیش کیا جائے اور بے آمیز صورت میں پیش کیا جائے۔ ان کا تعلق اس جلیل القدر ہستی کے ساتھ تھا جس کو اب ہم امام حمید الدین فراہی کے نام سے جانتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کے اس کام کے نتیجے میں دین کا وہ زاویۂ نظر سامنے آیا ہے جس کے بارے میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ دوسرا مکتب فکر ہے جس کا میں نے تعارف کرایا۔ اس میں سب سے زیادہ اگر کوئی شخصیت کامیاب رہی تو وہ امام حمید الدین فراہی کی شخصیت ہے اور ان کے شاگرد رشید امام امین احسن اصلاحی نے اسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی جدوجہد کی۔ میری حقیر کاوشیں بھی اسی ضمن میں ہیں۔ اس وقت تک جو کچھ ہو چکا ہے، اس میں پہلی چیز تو یہ تھی کہ قرآن مجید کی ایک پوری تفسیر اس طرز فکر کے تحت لکھی جائے جس میں قرآن حکومت کر رہا ہو، جس میں قرآن کو قطعی الدلالہ مان کر اس کی تفسیر کی جائے، جس میں قرآن مجید کی متواتر قراءت کو بنیاد بنا کر اس کا نقطۂ نظر سمجھایا جائے، جس میں قرآن مجید کے محکمات و متشابہات کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر کی بنیاد پر ہر چیز کو متعین کر کے پیش کر دیا جائے، جس میں قرآن حدیث پر بھی حکومت کرے، فقہ پر بھی حکومت کرے، فلسفے پر بھی حکومت کرے، تصوف پر بھی حکومت کرے، ہر چیز پر اس کی حکومت قائم ہو۔ چنانچہ ''تدبر قرآن'' اسی طرز فکر کا شاہ کار ہے۔

''تدبر قرآن'' کے معاملے میں دو مسئلے تھے: ایک مسئلہ یہ تھا کہ اس میں نظم کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، ترجمہ اس کے لحاظ سے نہیں ہوا اور دوسری چیز یہ تھی کہ اس میں پیش کش کا جو اسلوب اختیار کیا گیا، اس میں قرآن اور قاری کے درمیان مصنف کا اطناب حائل ہوتا ہے۔ بڑی غیر معمولی چیز ہے۔ ایک شاہ کار ہے فکر و تحقیق کا، لیکن یہ دو مسائل

ہیں۔ چنانچہ مجھے یہ خیال ہوا کہ ایک خدمت یہ بھی کرنی چاہیے کہ ان دونوں چیزوں کو سامنے رکھ کر قرآن مجید کا ایک ترجمہ کیا جائے اور پھر اس کے نئے حواشی لکھے جائیں۔ ''البیان'' اصل میں اسی پس منظر میں نمایاں ہوتی ہے۔

دوسری چیز یہ سامنے تھی کہ اب جو یہ سب کچھ ہو گیا ہے، اس کی روشنی میں متعین طور پر یہ بتایا جائے کہ دین فی الواقع ہے کیا؟ یعنی ظاہر ہے قرآن مجید پر بہت سا کام ہو گیا۔ قرآن مجید کے بہت سے محکمات واضح ہو گئے۔ ایک نیا طرز فکر وجود میں آ گیا۔ بے آمیز دعوت سامنے آ گئی۔ قرآن مجید کو جس طرح کہ اس کی حکومت قائم ہونی چاہیے، اس طریقے سے پیش کر دیا گیا، لیکن اب اس کا اطلاق اس پورے کے پورے دین کے مشمولات، اس کے Content پر بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ میں نے اس کو اپنا کام بنایا اور کم و بیش سترہ سال کی جدوجہد کے بعد آپ کی خدمت میں ''میزان'' پیش کی۔ یہ وہ کتاب ہے کہ اگر آپ غزالی کی ''احیاء علوم الدین''، شاہ ولی اللہ کی تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی ''اسلامی نظام زندگی'' کو سامنے رکھ کر تقابل سے اس کا مطالعہ کریں تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کس نوعیت کا کام ہے، اس میں کیا حقائق ہیں جو واضح کیے گئے ہیں، اس میں کس طریقے سے بے آمیز دعوت قرآن مجید کی پیش کی گئی ہے، جس طرح کہ وہ دین کو پیش کرتا ہے۔ میں پھر یہ بات عرض کر دوں کہ بہر حال اس طرح کے سب کام انسانی کام ہوتے ہیں۔ یہ سعی ہے، جدوجہد ہے اور جس طرح پہلے لوگوں نے جدوجہد کی ہے، اسی طرح ہمارے بعد آنے والے ہماری غلطیوں کی بھی اصلاح کریں گے، تاہم اپنی طرف سے میں نے اپنے حقیر علم کی حد تک اپنی استطاعت کی حد تک یہ کوشش کی کہ خدا کے دین کو بے کم و کاست خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر جس طرح کہ وہ ہے، پیش کر دیا ہے۔ آپ اس کے خاتمے کو پڑھیں تو میں نے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

اس کے بعد ایک بڑا کام یہ ہے کہ ہمارے پاس حدیث اور آثار کا ذخیرہ ہے۔ بہت بڑا ذخیرہ ہے، یعنی ہزاروں کی تعداد میں روایات ہیں جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے بیان ہوئی ہیں، اور ہزاروں ہی کی تعداد میں روایات و آثار ہیں جو صحابۂ کرام کی نسبت سے بیان ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ جس پر بہت کچھ آمیزش کر دی گئی۔ چیزیں اپنے سیاق و سباق سے الگ کر دی گئیں۔ ان کا مدعا بہت سی صورتوں میں غارت ہو گیا۔ چنانچہ محدثین کا ایک جلیل القدر گروہ پیدا ہوا جس نے اصول قائم کیے، تحقیق کی اور وہ کتابیں متعین کیں جن کو ہم صحاح ستہ کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ ایک بڑا روشن کام ہے، غیر معمولی کام ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں اس طرح کی روایات کے اندر سے انھوں نے انتخاب کیا ہے۔ یہ مسلمانوں

کی تاریخ کا ایسا کام ہے جس پر جتنا خدا کا شکر ادا کریں کم ہے، جتنا فخر کریں کم ہے۔ دنیا کی کسی قوم نے اپنے پیغمبر کی نسبت سے جو علم و عمل کا تاریخی ریکارڈ منتقل ہوتا ہے، اس پر وہ محنت نہیں کی جو ان لوگوں نے کی ہے۔ لیکن یہ بہر حال ایک انسانی کام ہے اور اب مدرسۂ فراہی کے تحت قرآن مجید کو جس طرح پیش کر دیا گیا ہے، دین کو جس طرح پیش کر دیا گیا ہے، اس میں بڑا کام یہ ہے کہ حدیث اور آثار کے اس بڑے ذخیرے کو اسی طریقے سے نقد و نظر کے اندر سے گزارا جائے۔ اس کا بھی جائزہ لیا جائے، اس کی بھی تنقیح کی جائے، اور پھر جس طرح کہ اس سے پہلے ''الجامع الصحیح'' مرتب کی گئی، امام بخاری نے مرتب کی، امام مسلم نے مرتب کی، اسی طرح کی ایک الجامع الصحیح اب پھر مرتب کی جائے اور اس میں جو روایت کی تحقیق میں سند کے لحاظ سے کوئی خامی رہ گئی، اس کو بھی دور کیا جائے۔ ہماری امت میں یہ کام پہلے بھی ہوتا رہا ہے، ایک مرتبہ پھر اس روایت کو زندہ کیا جائے اور سب سے بڑھ کر درایت، یعنی یہ بات کہ روایت کو علم و عقل کے مسلمات اور قرآن و سنت کی روشنی میں دیکھا جائے اور سب سے بڑھ کر خود اللہ کی کتاب کی روشنی میں دیکھا جائے، اس کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے۔ میرے پاس وقت ہوتا تو میں آپ کو اس کی کچھ مثالیں دے کر بتاتا کہ کیسی کیسی چیزیں ہیں جو ہمارے ہاں شہرت پا چکی ہیں۔ وہ نقد و نظر کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ یہ کام کیا جائے۔ چنانچہ میری زندگی کا اب اگر کوئی مقصد رہ گیا ہے تو وہ یہی ہے کہ اللہ اگر مجھے مہلت دیتا ہے تو اپنے فکر و نظر اور اپنے وقت کی اولین ترجیح کی حیثیت سے ''البیان'' کے بعد میں یہ کام سر انجام دوں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے مذہبی فکر کی تشکیل جدید کے لیے یہ تین کام ناگزیر ہیں۔ یعنی دین کو بے کم و کاست ایک کتاب کی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ یہ میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے حقیر علم کی حد تک ''میزان'' کی صورت میں اور اس کا خلاصہ ''الاسلام'' کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ قرآن مجید میں ''تدبر قرآن'' موجود ہے اس مدرسۂ فکر کے تحت، اور ''البیان'' بھی اللہ کی عنایت سے پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر اللہ کی توفیق شامل حال رہی تو شاید ایک دو سال میں میں اس سے فارغ ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد اگر اللہ مہلت دیتا ہے، اور اللہ ہی ہے جو سب فیصلے کرتا ہے اور اسی کے فیصلے حکمت پر مبنی ہوتے ہیں، تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑا کرنے کا کام حدیث ہی ہے۔ اور میں آپ سے بھی یہ درخواست کروں گا کہ میں نے اس ترجیح کو اپنی زندگی کی ترجیح بنایا ہوا ہے۔ اور آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس کام کو اگر ہم نہیں کریں گے اور اس کو اپنی پہلی ترجیح نہیں بنائیں گے تو اس سے دین کے صحیح فکر کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے، کیونکہ مسلمان امت میں سب سے زیادہ اثر اسی چیز کا ہے۔ تو احادیث و آثار پر اس کام کی ضرورت ہے۔

یہ میں نے آپ کے سامنے اس پوری دعوت کا پس منظر رکھ دیا ہے۔ اس پس منظر کو سامنے رکھیں اور پھر یہ دیکھیں کہ ہم آپ سے کیا تقاضا کرتے ہیں۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں دو چیزوں کو اپنے سامنے رکھا: دیانت داری کے ساتھ دین کو سمجھا جائے، اس کے صحیح حقائق جیسے وہ واضح ہو جائیں، ان کی گواہی دی جائے۔ اس میں اگر کل ایک بات معلوم تھی اور ہم اس کو بیان کر رہے تھے تو ادنیٰ حجاب کے بغیر اعتراف کر لیا جائے کہ ہماری غلطی تھی اور اس طرح دین میں علم کی روایت کو زندہ کریں۔ اور دوسری چیز یہ کہ جو کچھ بھی اللہ کی طرف سے ہم پر واضح ہو جائے، ہم اس کو لوگوں تک پہنچائیں۔ میں نے رسالے نکالے تو اسی چیز کو سامنے رکھا، ادارے بنائے تو اسی چیز کو سامنے رکھا، کتابیں لکھیں تو اسی چیز کو سامنے رکھا۔ آج بھی یہ کام کر رہا ہوں تو اسی چیز کو سامنے رکھ رہا ہوں۔ یہ اصل میں وہ کام ہے کہ جس میں آپ بھی اس کی نصرت کے لیے آگے بڑھیں۔ میں نے اس کے علاوہ کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا اپنے ساتھیوں سے، اپنے احباب سے، اپنے رفقا سے اور اپنے سننے والوں سے کہ وہ خود دین کو سمجھیں جس طرح کہ سمجھنے کا حق ہے۔ جو خدمت ہم ان کی کر سکتے ہیں، ہم وہ کریں اور اس کو سمجھیں اور اس کے بعد دوسروں تک اس کو پہنچانے کی سعی کریں۔ یہ سعی کس کس صورت میں کرنی ہے؟ اس کا یہ موقع نہیں ہے، دوسرے لوگ بتائیں گے۔ یہ ادارہ بھی اسی مقصد سے بنایا گیا تھا۔ اس وقت بھی یہ دعوت اگر برپا ہے تو اسی مقصد سے برپا ہے۔ میں نے ہمیشہ ان دونوں چیزوں کو سامنے رکھ کر زندگی بسر کی ہے۔ پہلی ترجیح یہ کہ جو اصل Content ہے، اس کو واضح کیا جائے۔ میری آج بھی یہی ترجیح ہے اور میں اسی کو پہلی ترجیح کے طور پر قائم رکھ کر ہمیشہ کام کرتا رہا ہوں اور اب بھی ان شاء اللہ کروں گا۔ دوسری یہ کہ جتنا کچھ تھوڑا وقت اس کے بعد بچے، وہ اس دعوت کو پہنچانے میں صرف کیا جائے۔ میں اللہ کا شکر کرتا ہوں کہ اس میں مجھے بہترین ساتھی ملے، بہترین رفیق ملے۔ اس وقت بھی جو نئے نوجوان سامنے آ رہے ہیں، ان کے لیے بھی میں یہی دعا کرتا ہوں، ان سے بھی یہی توقع رکھتا ہوں۔ وہ بھی اسی طریقے سے دین کو سمجھیں گے کہ جس طرح سمجھنے کا حق ہے۔ دین کی دعوت سے زیادہ اجنبی کوئی چیز نہیں ہے اور جب اس کو بے آمیز صورت میں پیش کیا جاتا ہے تو لوگ ہار لے کر آپ کے گلے میں ڈالنے کے لیے نہیں بڑھتے۔ اس میں پھر آپ کو پتھروں کا اور سنگ باری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس میں ہر قدم پر مشکلات ہوتی ہیں۔ اس میں وہی کچھ پیش آتا ہے جو انبیاے کرام کے ساتھ پیش آیا۔

یہ کوئی سیاسی چیز نہیں ہے، یہ کوئی اس نوعیت کی بھی چیز نہیں ہے جس میں عام طور پر تحریکیں اور دعوتیں برپا ہوتی ہیں۔ یہ درحقیقت ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ دین کو سمجھنے کا عمل ہے اور پھر اسی ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ، اسی

محبت کے ساتھ، اسی اخلاص کے ساتھ، اسی خیر خواہی کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کا عمل ہے۔ اس کے لیے آپ کو اپنے اندر کیا تبدیلیاں کرنی ہیں، وہ میں نے ''ہماری دعوت'' کے زیر عنوان بیان کر دی ہیں اور ہم آپ سے کیا توقع کرتے ہیں، وہ بھی اس میں بیان کر دیا ہے۔ اس کو پڑھیے اور پھر یہ دیکھیے کہ کیا آپ کے پاس وقت ہے جو اس کے لیے دے سکیں؟ کیا آپ کے پاس وسائل ہیں جو اس کے لیے دے سکیں؟ کیا آپ اس کی تائید ہی کے لیے تھوڑی بہت زبان سے بات کر سکتے ہیں؟ اپنے عمل سے لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں؟ یہ وہ کام ہے جو ہمیشہ ہوتے رہنا چاہیے، آج بھی ہونا چاہیے، کل بھی ہونا چاہیے۔

میں جو خدمت اس سلسلے میں انجام دے سکتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جہاں کوئی اشکال پیش آ جائے تو اسے واضح کر دوں۔ آپ کی طرف سے سوال آ جائے تو اس کا جواب دے دوں۔ اگر کسی حقیقت کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہو، وہ کر دوں۔ لیکن میرا اصلی کام وہی ہے کہ میں قرآن مجید کے بعد اور اسلام کی شرح و وضاحت کے بعد حدیث کے ذخیرے پر نگاہ ڈالوں اور یہ کوشش کروں کہ آپ کو ایک ایسی کتاب بھی دے سکوں جس کو آپ اس اعتماد کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں کہ یہ درحقیقت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و عمل کا وہ حصہ ہے جو بڑی حد تک آمیزشوں سے پاک رہا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس کام کو اسی یک سوئی کے ساتھ کرنے کی توفیق دے اور آپ کو بھی اس کو سمجھنے، دوسروں تک پہنچانے کی توفیق دے۔ یہ وہ چیز ہے کہ جس کے لیے شب و روز بسر ہونے چاہییں، جس کے لیے زندگی کی بہترین قوتیں صرف ہونی چاہییں، جس کے لیے نوجوانوں پر اگر ان کے پاس کوئی وقت بچے تو سب سے پہلے نکالنا چاہیے، جس کو اپنی زندگی کے معمولات انجام دینے کے بعد لوگوں کی ترجیح بننا چاہیے۔

یہ دین ہمارا دین ہے۔ یہ خدا کی دعوت ہے۔ یہ خدا کے پیغمبروں کی دعوت ہے، اس وقت یہ اجنبی ہو رہا ہے۔ اس اجنبیت کو ہم نے دور کرنا ہے اور اگر صحیح بات ہم پر واضح ہے تو پھر اس کو شایستگی کے ساتھ، تہذیب کے ساتھ، حوصلے کے ساتھ، ہمت کے ساتھ، عزم کے ساتھ، خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ، محبت کے ساتھ دوسروں تک پہنچانا ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں یہ دونوں کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ میں نے عرض کر دیا ہے کہ میری ترجیح کیا رہی ہے اور وہ ترجیح آج بھی اسی طریقے سے قائم ہے اور جو خدمت میں انجام دے سکتا ہوں، اس کے حدود بھی واضح کر دیے ہیں۔ آپ سے میری یہی توقع ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں آپ میں سے ہر شخص کو سب سے پہلے اس کو سیکھنے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرنی ہے۔ وقت دیجیے تاکہ آپ خود اس کو سیکھیں۔ آپ کے اندر وہ اعتماد پیدا ہو جو اس

کو سیکھنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔آپ سمجھیں کہ کیا چیز ہے جو ہم لوگوں کے سامنے لے کر جا رہے ہیں اور پندرہ صدیوں کی تاریخ کے پس منظر میں لے کر جا رہے ہیں اور پھر اس کے کیا اثرات ہیں جو آنے والے دور پر ہونے والے ہیں۔اس میں اپنا کردار انجام دیں اور پورے عزم اور حوصلے کے ساتھ انجام دیں۔

وہی چراغ کہ جلتی ہے آرزو جس میں
اندھیری شب ہے تو لایا ہوں کارواں کے لیے

وَاَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ اَجْمَعِیْنَ!

ٹرانسکرائب: راجہ قمر
تدوین: سید منظور الحسن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانفال

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

اِذۡ تَسۡتَغِیۡثُوۡنَ رَبَّکُمۡ فَاسۡتَجَابَ لَکُمۡ اَنِّیۡ مُمِدُّکُمۡ بِاَلۡفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ مُرۡدِفِیۡنَ ﴿۹﴾ وَمَا جَعَلَہُ اللّٰہُ اِلَّا بُشۡرٰی وَلِتَطۡمَئِنَّ بِہٖ قُلُوۡبُکُمۡ وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ

یاد کرو، جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے[۱۹] تو اُس نے تمھاری فریاد سن لی (اور فرمایا کہ) میں ایک ہزار فرشتے تمھاری مدد کے لیے بھیج رہا ہوں جو لگاتار پہنچتے رہیں گے۔[۲۰] یہ اللہ نے صرف اِس لیے کیا کہ تمھارے لیے خوش خبری ہو اور اِس لیے کہ تمھارے دل اِس سے مطمئن ہوں۔ (ورنہ حقیقت

۱۹؎ مسلمانوں کی تعداد چونکہ اِس جنگ میں بہت تھوڑی تھی اور وہ بے سروسامان بھی تھے، اِس لیے استاذ امام کے الفاظ میں، ہر شخص سراپا عجز و نیاز اور یک سر دعا و فریاد بنا ہوا تھا۔ اِن دعاؤں میں لوگوں نے کس طرح اپنے دل نکال کر اپنے رب کے سامنے رکھ دیے تھے، اُس کا اندازہ کسی حد تک اُس دعا سے کیا جا سکتا ہے جو اُس موقع پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ آپ نے عرض کیا تھا: ''خدایا، یہ ہیں قریش، اپنے سامان غرور کے ساتھ آئے ہیں تا کہ تیرے رسول کو جھوٹا ثابت کر دیں۔ خدایا، اب تیری وہ مدد آ جائے جس کا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ خدایا، اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہو گئی تو روے زمین پر پھر کوئی تیری عبادت نہ کرے گا۔*''

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/ ۲۳۹۔ تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/ ۳۸۳۔

عِنۡدِاللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۱۰﴾ اِذۡ یُغَشِّیۡکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنۡهُ وَیُنَزِّلُ عَلَیۡکُمۡ
مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَهِّرَکُمۡ بِهٖ وَیُذۡهِبَ عَنۡکُمۡ رِجۡزَ الشَّیۡطٰنِ وَلِیَرۡبِطَ عَلٰی

یہ ہے کہ) مدد تو اللہ ہی کے پاس سے آتی ہے[21]۔ یقیناً اللہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔ یاد کرو، جب اللہ اپنی طرف سے تمھاری تسکین کے لیے تم پر اونگھ طاری کررہا تھا[22] اور آسمان سے تم پر پانی برسا رہا تھا[23] کہ اُس کے ذریعے سے تمھیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی نجاست دور کرے[24] اور (تمھیں کچھ

۲۰؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ میدان جنگ میں حوصلے کو برقرار رکھنے کے لیے سب سے زیادہ دخل اِسی چیز کو ہوتا ہے کہ لڑنے والوں کو اِس بات کا اطمینان رہے کہ جب ذرا کمزور ہوں گے تو پیچھے سے کمک لازماً پہنچ جائے گی۔

۲۱؎ مطلب یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کیا جائے تو جو کچھ بھی مدد حاصل ہوتی ہے، خدا ہی سے حاصل ہوتی ہے اور تمھیں بھی لازماً حاصل ہوتی، مگر پہلے اِس لیے بتا دیا گیا کہ یہ چیز تمھارے لیے خوش خبری ہو اور تمھارے حوصلے کو برقرار رکھنے کا ذریعہ بن جائے۔

۲۲؎ آیت میں مضارع کا صیغہ ہے۔ اِس کے ساتھ حرف 'اذ' ہو تو فعل ناقص کی ضرورت نہیں ہوتی، اُس کا مفہوم آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی صورت اِس سے پیچھے 'یَعِدُکُمۡ' اور 'تَسۡتَغِیۡثُوۡنَ' میں بھی ہے۔ آیت میں نیند کے بجاے اونگھ کا ذکر ہوا ہے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ اِس طرح کی صورت حال میں اونگھ آجائے تو آدمی کچھ سو ہی لیتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ نہایت برمحل استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے یہ چیز مسلمانوں پر اڑھا دی، جیسا کہ 'یُغَشِّیۡکُمۡ' کے لفظ سے واضح ہے اور وہ جنگ سے پہلے رات میں سو لیے۔ اِس سے اُن کے اعصاب اور دل و دماغ کو اتنا سکون حاصل ہو گیا کہ وہ تازہ دم ہو کر میدان میں اتر سکیں۔ یہ فی الواقع خدا کی تائید کا ظہور تھا، اِس لیے کہ جہاں صبح ایک دل بادل فوج کا سامنا کرنا ہو، وہاں رات میں سو لینا آسان نہیں ہوتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...میدان جنگ میں فوج کے لیے سو لینے کا موقع مل جانا ہی اول تو بڑی نعمت ہے، لیکن اِس سے بڑی نعمت اِس موقع سے صحیح فائدہ اٹھا سکنا ہے۔ اِس لیے کہ نیند کے لیے موقع مل جانا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اِس کا اصلی انحصار دل و دماغ کی حالت پر ہے اور یہ چیز ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی، اُنھی کو حاصل ہوتی ہے جن پر خداے مقلب القلوب اپنے فضل خاص سے یہ سکینت طاری کر دے۔'' (تدبر قرآن ۳/۴۴۵)

۲۳؎ یعنی زمین کا پانی اگر میسر نہیں تھا تو اپنی عنایت خاص سے اُس نے آسمان کو حکم دیا کہ وہ اپنا پانی برسا دے۔ رات

قُلُوۡبِکُمۡ وَ یُثَبِّتَ بِہِ الۡاَقۡدَامَ ﴿۱۱﴾ اِذۡ یُوۡحِیۡ رَبُّکَ اِلَی الۡمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیۡ مَعَکُمۡ فَثَبِّتُوا
الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سَاُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الرُّعۡبَ فَاضۡرِبُوۡا فَوۡقَ الۡاَعۡنَاقِ
وَاضۡرِبُوۡا مِنۡہُمۡ کُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ شَآقُّوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ

دیر کے لیے سلا کر) تمھارے دلوں کو مضبوط کرے اور تمھارے قدم جما دے[۲۵]۔ یاد کرو، جب تمھارا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا[۲۶] کہ میں تمھارے ساتھ ہوں، تم ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو[۲۷]۔ میں اِن منکروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں[۲۸]، سوتم اِن کی گردنوں پر مارو اور اِن کے پور پور پر چوٹ

کی نینداور اِس سے پہلے فرشتوں کے اترنے کی بشارت کے بعد یہ تیسری تائیدالٰہی ہے جو بدر کے موقع پر ظاہر ہوئی۔

۲۴؎ یہ اُن وساوس کی طرف اشارہ ہے جو ناپاکی کی حالت میں ہجوم کر سکتے اور عین میدان جنگ میں لوگوں کو خدا کی یاد اور اُس کی تائید ونصرت پر اعتماد سے محروم کر سکتے تھے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ پانی کے حیوانی فوائد چونکہ ہر شخص کے علم میں ہیں، اِس لیے اللہ نے اُن سے صرف نظر فرمایا اور اُن کے بجاے پانی کی روحانی برکات کا ذکر کیا ہے۔ بندۂ مومن کے لیے زیادہ اہمیت اِنھی کی ہوتی ہے۔ اِس موقع پر بھی صحابۂ کرام کو زیادہ پریشانی یہی ہوسکتی تھی کہ نماز کے لیے وضو کیسے ہوگا، طہارت کے لیے کیا کریں گے اور غسل کی ضرورت پیش آ گئی تو اُس کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے گی؟

۲۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَلِیَرۡبِطَ عَلٰی قُلُوۡبِکُمۡ وَیُثَبِّتَ بِہِ الۡاَقۡدَامَ'۔ یہ دونوں باتیں پانی سے نہیں، بلکہ نیند سے متعلق ہیں۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ نیند ہی سے متعلق ہوسکتی ہیں۔ قرآن نے یہاں ترتیب صعودی کا طریقہ اختیار کیا ہے، یعنی پہلے پانی اور اُس کے بعد نیند کے فوائد بیان کیے ہیں۔ یہی اسلوب سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱۸۵ میں بھی ہے۔ 'وَلِیَرۡبِطَ' میں حرف 'ل' کا اعادہ اِسی لیے کیا گیا ہے۔

۲۶؎ اِس سے معلوم ہوا کہ فرشتے بھی اپنے علو مرتبت کے باوجود خدا تک براہ راست رسائی نہیں رکھتے۔ اُس کے احکام اُنھیں بھی وحی کے ذریعے سے ہی ملتے ہیں۔

۲۷؎ اِس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ فرشتے بھی خدا کی معیت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسری یہ کہ بدر کی جنگ میں بھی اصلی چیز مسلمانوں کی اپنی شجاعت اور ثابت قدمی تھی۔ فرشتوں کا کام اُنھیں ایک طرف بٹھا کر خود لڑنا نہیں تھا، بلکہ منکروں کو ٹھیک اُن کے سامنے کر دینا اور اُنھیں ثابت قدم رکھنا تھا۔

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ
النَّارِ ﴿۱۴﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾
وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ

لگاؤ[۲۹]۔ یہ اِس لیے کہ یہ اللہ اور اُس کے رسول کے مقابلے کو اُٹھے ہیں اور جو اللہ اور اُس کے رسول کے مقابلے کو اٹھتے ہیں تو اللہ (اُن کے لیے) سخت سزا دینے والا ہے —— یہ ہے (تمھاری سزا)، اِسے (ابھی) چکھ لو اور (جان لو کہ آگے) منکروں کے لیے آگ کا عذاب ہے[۳۰]۔ ۹-۱۴

ایمان والو، جب اِن منکروں سے تمھارا مقابلہ باقاعدہ فوج کشی کی صورت میں ہو[۳۱] تو اِنھیں پیٹھ نہ دکھاؤ اور (خوب سمجھ لو کہ) جو اُس وقت اِن کو پیٹھ دکھائے گا، اِلّا یہ کہ جنگ کے لیے پینترا بدلنا چاہتا ہو

۲۸؎ لڑنے والوں کی اصلی طاقت اُن کے حوصلے میں ہوتی ہے، اِس لیے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ منکرین جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ بھی نہیں کر سکیں گے۔

۲۹؎ یعنی مسلمانوں کی تلواروں سے۔ یہ اُس بے بسی کی تصویر ہے جو مرعوبیت کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...حریف میں جب تک دم خم ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اِس بات کا موقع وہ مشکل ہی سے دیتا ہے کہ آپ جہاں چاہیں، اُس کے مار دیں، لیکن جب اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تو پکڑ کر اُس کی چندیا پر جوتے لگا دیجیے، وہ چوں بھی نہ کر سکے گا۔ تعیین محل کے ساتھ جب کسی کو مارنے کے لیے کہا جائے تو اس میں اُس کی تحقیر و تذلیل بھی مد نظر ہوتی ہے اور اِس سے اُس کی بے بسی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۴۴۹)

۳۰؎ قرآن کے عام اسلوب کے مطابق اثنائے کلام میں خطاب کا رخ پھر گیا ہے اور یہ بات قریش کو مخاطب کر کے فرما دی ہے۔

۳۱؎ یعنی گوریلا وار فیر یا کر و فر کی جنگ کی صورت میں نہیں، جس میں حملہ کرو، لوٹو اور بھاگ جاؤ کے اصول پر جنگ کی جاتی ہے، بلکہ جب منظّم فوج کشی کے طریقے پر مقابلہ ہو۔

مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٦﴾ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ

یا اپنی فوج کے کسی دوسرے حصے سے ملنا چاہتا ہو تو وہ خدا کا غضب لے کر لوٹا۔ اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے[۳۲]۔ (ایمان والو، تم کیوں جان چراؤ، جبکہ تمھاری طرف سے خدا لڑتا ہے)؟ سو (حقیقت یہ ہے کہ اِس جنگ میں) تم نے اِن کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے اِن کو قتل کیا ہے اور (اے پیغمبر)، جب تو نے اِن پر خاک پھینکی تو تو نے نہیں پھینکی، بلکہ اللہ نے پھینکی ہے[۳۳]، (اِس لیے کہ منکروں کو اپنی شانیں دکھائے) اور اِس لیے کہ مسلمانوں پر اللہ اپنی طرف سے خوب عنایت فرمائے[۳۴]۔ بے شک،

۳۲۔ اِس سے معلوم ہوا کہ خدا کے حکم پر اور قتال فی سبیل اللہ کے لیے میدان میں اترنے کے بعد بزدلی اور فرار کی نوعیت کا پیٹھ دکھانا حرام ہے۔ کسی صاحب ایمان کو ہرگز اِس کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بے اعتمادی، دنیا کی آخرت پر ترجیح اور موت وحیات کو اپنی تدبیر پر منحصر قرار دینے کا جرم ہے جس کی ایمان کے ساتھ کوئی گنجایش نہیں مانی جاسکتی۔

۳۳۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ جب مسلمانوں اور کفار کے لشکر آمنے سامنے ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر خاک زمین سے اٹھائی اور 'شاھت الوجوہ' کہہ کر کفار کی طرف پھینک دی*۔ یہ لعنت کا جملہ اور قدیم ترین زمانے سے لعنت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ مسلمان اِس کے ساتھ ہی یک بارگی حملہ آور ہو گئے۔ قرآن میں یہ اِسی واقعے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''یہاں زبان کا یہ اسلوب بھی نگاہ میں رہے کہ بعض مرتبہ فعل کی نفی سے مقصود نفس فعل کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ اِس فعل کے ساتھ اُن شاندار نتائج کی نسبت کی نفی ہوتی ہے جو اِس فعل کے پردے میں ظاہر ہوئے۔ مٹھی بھر نہتے مسلمانوں کا قریش کی دل بادل غرق آہن فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ڈال دینا یا آں حضرت کے دست مبارک سے پھینکی ہوئی چٹکی بھر خاک کا ایک ایسا طوفان بن جانا کہ تمام کفار کو اپنی اپنی آنکھوں کی پڑ جائے، یہ مسلمانوں کی چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تلواروں یا پیغمبر کی 'رمی' کے کارنامے نہیں تھے، بلکہ اُس دست غیب کے کارنامے تھے جو مسلمانوں کی میانوں اور پیغمبر عالم کی آستینوں میں چھپا ہوا تھا۔'' (تدبر قرآن ۳/۴۵۱)

---

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/۲۴۵۔

سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِکُمۡ وَاَنَّ اللّٰہَ مُوۡہِنُ کَیۡدِ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۸﴾ اِنۡ تَسۡتَفۡتِحُوۡا فَقَدۡ جَآءَکُمُ الۡفَتۡحُ ۚ وَاِنۡ تَنۡتَہُوۡا فَہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَاِنۡ تَعُوۡدُوۡا نَعُدۡ ۚ وَلَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡکُمۡ

اللہ سمیع و علیم ہے۔ یہ جو کچھ ہوا، تمھارے سامنے ہے[۳۵] اور (اِس کے ساتھ) یہ (بشارت) بھی کہ اللہ اِن منکروں کی تمام تدبیریں[۳۶] بے کار کر کے رہے گا۔ اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو (قریش کے لوگو)، یہ فیصلہ آ گیا ہے[۳۷]۔ اگر (اب بھی) باز آ جاؤ تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر پھر یہی کرو گے تو ہم بھی

۳۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَلِیُبۡلِیَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡہُ بَلَآءً حَسَنًا'۔ اِس کا معطوف علیہ یہاں عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق حذف کر دیا ہے، اِس لیے کہ اوپر کے الفاظ سے وہ خود بخود واضح ہو رہا ہے۔

۳۵؎ اصل میں 'ذٰلِکُمۡ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ جب اِس طرح آتا ہے تو پورے جملے کا قائم مقام ہوتا ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔ آگے حرف ربط 'و' کا تعلق اِسی جملے کے مفہوم سے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ جملہ ٹھیک ٹھیک اوپر کے جملہ 'ذٰلِکُمۡ فَذُوۡقُوۡہُ، وَاَنَّ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابَ النَّارِ' کا مدمقابل جملہ ہے، یعنی کفار کے لیے یہ چپت نقد ہے جو اُن کو بدر میں لگی اور تمھارے لیے یہ فتح عظیم نقد ہے جو تمھیں حاصل ہوئی۔ اب آگے اُن کے لیے دوزخ ہے اور تمھارے لیے یہ بشارت کہ کفار کی سازشوں کے تمام تار و پود بکھر جائیں گے اور دین حق کا بول بالا ہو گا۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۴۵۲)

۳۶؎ اصل میں لفظ 'کَیۡد' آیا ہے۔ اِس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ بدر کی جنگ مسلمانوں کے کسی اقدام کے نتیجے میں نہیں ہوئی، بلکہ قریش کے لیڈروں کی سازش کے نتیجے میں ہوئی۔ اُنھوں نے قافلۂ تجارت کی حفاظت کا بہانہ تراشا اور ایک لشکر جرار لے کر مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اِسی بنا پر اِس کو اور اِس کے بعد بھی جو کچھ وہ کریں گے، اُسے 'کَیۡد' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی چال اور سازش کے ہیں۔

۳۷؎ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش کو اِس جنگ میں اپنی فتح کا کامل یقین تھا۔ بدر کے لیے روانگی سے پہلے اُنھوں نے کعبے کے پردے پکڑ کر دعا مانگی تھی کہ خدایا، اُس کی مدد کر جو دونوں لشکروں میں سب سے اعلیٰ ہو، جو دونوں گروہوں میں سب سے اشرف ہو، جو دونوں قبیلوں میں سب سے بہتر ہو*۔ اِس طرح خود اُنھوں نے اِس جنگ

* تفسیر القرآن العظیم ۲/ ۳۹۲۔

فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴿۱۹﴾

یہی کریں گے اور تمھاری جمعیت، خواہ کتنی ہی زیادہ ہو، تمھارے کچھ کام نہ آئے گی۔ (خوب سمجھ لو کہ) اللہ مومنوں کے ساتھ ہے[۳۸]۔ ۱۵-۱۹

کو حق و باطل میں فیصلے کی میزان ٹھیرا لیا تھا، چنانچہ یہ فیصلہ آ گیا۔ آگے آیت ۴۱ میں غزوۂ بدر کو قرآن نے 'یَوْمَ الْفُرْقَان' کہا ہے۔ اُس کی وجہ یہی ہے۔

۳۸؎ یہ پوری آیت نصیحت بھی ہے اور فضیحت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکتے ہو کہ آیندہ مزید تیاری اور قوت و شوکت کے ساتھ حملہ آور ہو گے۔ سو جان لو کہ یہ چیز بھی تمھارے کچھ کام نہ آئے گی، اِس لیے کہ اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ (آخری) ٹکڑا ساری آیت کی جان ہے اور اِس کے دو لفظوں میں کفار کے لیے دھمکیوں کا اور اہل ایمان کے لیے بشارتوں کا ایک جہان ہے۔ فرمایا کہ اب آئے جس کو آنا ہو اور لڑے جس کو لڑنا ہو اور جمع کرے وہ جتنی جمعیت جمع کر سکتا ہو، اہل ایمان کے ساتھ ہم ہیں ہم!! سبحان اللہ۔" (تدبر قرآن ۳/ ۴۵۳)

[باقی]

محمد رفیع مفتی

قانون جہاد

نظم اجتماعی میں امیر کی حیثیت

(۱)

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: مَنْ أَطَاعَنِیْ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ وَمَنْ یُّطِعِ الْأَمِیْرَ فَقَدْ أَطَاعَنِیْ وَمَنْ یَعْصِ الْأَمِیْرَ فَقَدْ عَصَانِیْ وَإِنَّمَا الْإِمَامُ جُنَّةٌ یُقَاتَلُ مِنْ وَرَائِهِ وَیُتَّقٰی بِهِ فَإِنْ أَمَرَ بِتَقْوَی اللّٰهِ وَعَدَلَ فَإِنَّ لَهُ بِذٰلِكَ أَجْرًا وَإِنْ قَالَ بِغَیْرِهِ فَإِنَّ عَلَیْهِ مِنْهُ. (بخاری، رقم ۲۹۵۷)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: جس نے میری اطاعت کی: اس نے اللہ کی اطاعت کی، جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی، جس نے امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ مسلمانوں کا حکمران ان کی سپر ہے، قتال اسی کے پیچھے رہ کر کیا جاتا ہے اور لوگ اپنے لیے اسی کی آڑ پکڑتے ہیں۔ چنانچہ اگر وہ اللہ سے ڈرتے رہنے کا

حکم دیتا اور عدل کرتا ہے تو اسے اس کا اجر ملے گا، اور اگر اس نے اس کے علاوہ رویہ اختیار کیا تو اسے اس کی وجہ سے سزا ملے گی۔''

توضیح:

اس حدیث میں درج ذیل دو باتیں بیان ہوئی ہیں:

پہلی یہ کہ اللہ، رسول اور مسلمانوں کے امیر میں کامل ہم آہنگی ہے۔ تینوں کی اطاعت دراصل ایک وحدت ہے، یعنی امیر کی اطاعت نبی کی اطاعت کا حصہ ہے اور نبی کی اطاعت اللہ کی اطاعت کا حصہ ہے۔ چنانچہ آپؐ نے امیر کی اطاعت کو اپنی اور اپنی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا۔ اسی طرح آپ نے امیر کی نافرمانی کو اپنی اور اپنی نافرمانی کو اللہ کی نافرمانی قرار دیا ہے۔

دوسری یہ کہ مسلمانوں کا امیر ان کے لیے ڈھال کی مثل ہوتا ہے، کیونکہ وہی ان کو دشمنوں سے بچاتا ہے، اور مسلمان اسی کی سرکردگی میں جنگ کرتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کا سارا معاملہ دراصل مسلمانوں کے امیر ہی سے متعلق ہے۔ یہ کوئی انفرادی عمل نہیں ہے۔

فرد اور قوم کے مفاد کا ٹکراؤ

(۲)

عَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ وَمَرْوَانَ يُصَدِّقُ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا حَدِيثَ صَاحِبِهِ قَالَا: خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَمَنَ الْحُدَيْبِيَةِ... رَجَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى الْمَدِينَةِ فَجَاءَهُ أَبُو بَصِيرٍ رَجُلٌ مِّنْ قُرَيْشٍ وَهُوَ مُسْلِمٌ فَأَرْسَلُوا فِي طَلَبِهِ رَجُلَيْنِ، فَقَالُوا: الْعَهْدَ الَّذِي جَعَلْتَ لَنَا فَدَفَعَهُ إِلَى الرَّجُلَيْنِ فَخَرَجَا بِهِ حَتّٰى بَلَغَا ذَا الْحُلَيْفَةِ فَنَزَلُوا يَأْكُلُونَ مِنْ تَمْرٍ لَهُمْ فَقَالَ أَبُو بَصِيرٍ لِأَحَدِ الرَّجُلَيْنِ: وَاللّٰهِ إِنِّي لَأَرٰى سَيْفَكَ هٰذَا يَا فُلَانُ جَيِّدًا فَاسْتَلَّهُ الْآخَرُ

فَقَالَ: أَجَلُ وَاللّٰهِ إِنَّهُ لَجَيِّدٌ لَقَدُ جَرَّبُتُ بِهِ ثُمَّ جَرَّبُتُ فَقَالَ أَبُو بَصِيرٍ أَرِنِى أَنُظُرُ إِلَيُهِ فَأَمُكَنَهُ مِنُهُ فَضَرَبَهُ حَتّٰى بَرَدَ وَفَرَّ الُآخَرُ حَتّٰى أَتَى الُمَدِينَةَ فَدَخَلَ الُمَسُجِدَ يَعُدُوُ فَقَالَ رَسُوُلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ حِيُنَ رَآهُ: لَقَدُ رَأَى هٰذَا ذُعُرًا فَلَمَّا انُتَهٰى إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ قَالَ: قُتِلَ وَاللّٰهِ صَاحِبِى وَإِنِّى لَمَقُتُوُلٌ، فَجَاءَ أَبُو بَصِيرٍ فَقَالَ: يَا نَبِيَّ اللّٰهِ قَدُ وَاللّٰهِ أَوُفَى اللّٰهُ ذِمَّتَكَ قَدُ رَدَدُتَّنِى إِلَيُهِمُ ثُمَّ أَنُجَانِى اللّٰهُ مِنُهُمُ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ: وَيُلُ أُمِّهِ مِسُعَرَ حَرُبٍ لَوُ كَانَ لَهُ أَحَدٌ فَلَمَّا سَمِعَ ذٰلِكَ عَرَفَ أَنَّهُ سَيَرُدُّهُ إِلَيُهِمُ فَخَرَجَ حَتّٰى أَتٰى سِيفَ الُبَحُرِ... (بخاری، رقم ۲۷۳۱، ۲۷۳۲)

مِسور بن مخرمہ اور مروان بن حکم باہم تصدیق کرتے ہوئے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (صلح) حدیبیہ کے زمانے میں (مدینہ سے مکہ کے لیے) نکلے ...(حدیبیہ کے مقام پر قریش کے ساتھ معاہدے کا واقعہ پیش آیا اور پھر جب) آپ مدینے واپس تشریف لائے، تو قریش کا ایک فرد ابوبصیر مسلمان ہوکر آپ کے پاس آ گیا۔ قریش نے اسے واپس لانے کے لیے دو آدمیوں کو بھیجا۔ انھوں نے آ کر کہا کہ آپ کے ساتھ ہمارا معاہدہ ہو چکا ہے، (لہٰذا، آپ یہ آدمی ہمیں سونپ دیں) چنانچہ آپ نے معاہدے کے مطابق ابوبصیر کو ان کے سپرد کر دیا۔ وہ اسے لے کر چل دیے، یہاں تک کہ ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو وہاں وہ کھجوریں کھانے کے لیے اپنی سواریوں سے اترے۔ ابوبصیر نے ان میں سے ایک آدمی سے کہا: بھائی، تمھاری تلوار تو بخدا بڑی عمدہ معلوم ہوتی ہے، اس نے یہ سن کر تلوار اپنی نیام سے نکال لی اور کہا: ہاں، اللہ کی قسم یہ بڑی عمدہ ہے، میں اس کا بارہا تجربہ کر چکا ہوں۔ ابوبصیر نے کہا ذرا مجھے بھی دکھاؤ تو اس نے وہ انھیں دے دی۔ انھوں نے اس پر تلوار سے ایسا وار کیا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا اور دوسرا شخص مدینے کی طرف بھاگ گیا اور دوڑتا ہوا مسجد نبوی میں داخل ہوا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو فرمایا: یہ تو خوف زدہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر جب وہ آپ کے پاس آیا تو اس نے کہا: بخدا، میرا ساتھی مارا گیا ہے اور میں بھی بس مرنے ہی والا ہوں۔ اتنے میں اس کے پیچھے ابوبصیر بھی آ پہنچے اور کہنے لگے: اے اللہ کے نبی، بخدا، اللہ نے آپ کی ذمہ داری پوری کر دی ہے، آپ نے (اپنے عہد کے مطابق) مجھے ان کے سپرد کر دیا تھا، پھر اللہ نے مجھے ان سے نجات دلا دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی یہ بات سن کر فرمایا: اس کی ماں پر آفت آئے، اسے کچھ ساتھی مل گئے ہوتے تو یہ جنگ کی آگ بھڑکا دیتا۔ جب انھوں نے یہ سنا تو جان لیا کہ آپ انھیں دوبارہ ان کے حوالے کر دیں گے۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکلے اور سمندر کے کنارے پر آ گئے...۔

توضیح:

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جہاد و قتال کا سارا معاملہ امیر سلطنت ہی سے متعلق ہے۔ اس کی اطاعت سے باہر ہو کر لڑنے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔

چنانچہ ابوبصیر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دوبارہ آتے ہیں تو یہ صاف محسوس کر لیتے ہیں کہ آپ اپنے معاہدے کے مطابق انھیں دوبارہ قریش کے حوالے کر دیں گے۔ بحیثیت قوم مسلمانوں کا مفاد اسی چیز میں تھا کہ وہ قریش کے ساتھ اپنے عہد کی پاس داری کریں، جبکہ ابوبصیر کا ذاتی مفاد اپنی آزادی میں تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی آزادی کے لیے یہ راستہ اختیار کیا کہ وہ مسلمانوں کی اجتماعیت ہی سے الگ ہو گئے۔ اگر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کے دائرے میں رہتے، تو آپ معاہدے کے مطابق انھیں لازماً واپس کر دیتے۔

مقبول جہاد

(۳)

عَنْ أَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: الرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلذِّکْرِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ

لِيُرٰى مَكَانُهُ فَمَنْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ؟ قَالَ: مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. (بخاری، رقم ۲۸۱۰۔ مسلم، رقم ۱۹۰۴، رقم مسلسل ۴۹۱۹)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ کوئی مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے لڑتا ہے، کوئی شہرت اور نام وری کے لیے لڑتا ہے، کوئی اپنی بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے، فرمائیے کہ ان میں سے کس کی لڑائی اللہ کی راہ میں ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اللہ کی راہ میں لڑائی تو صرف اس کی ہے جو محض اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے میدان میں اترے۔

(۴)

عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: أَرَأَيْتَ رَجُلًا غَزَا يَلْتَمِسُ الْأَجْرَ وَالذِّكْرَ مَالَهُ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا شَيْءَ لَهُ فَأَعَادَهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ يَقُوْلُ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا شَيْءَ لَهُ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا كَانَ لَهُ خَالِصًا وَابْتُغِيَ بِهِ وَجْهُهُ. (نسائی، رقم ۳۱۴۲)

حضرت ابوامامہ باہلی (رضی اللہ عنہ) روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: اس شخص کے بارے میں فرمائیے جو مالی فائدے اور نام وری کے لیے جنگ کرتا ہے، اسے کیا ملے گا؟ آپ نے جواب دیا: اسے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اس شخص نے تین مرتبہ یہی بات پوچھی اور آپ نے یہی جواب دیا کہ اسے کچھ بھی نہیں ملے گا، پھر آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کوئی عمل بھی اس وقت تک قبول نہیں کرتا، جب تک کہ وہ خالص نہ ہو اور اس کی رضا مندی کے لیے نہ

کیا جائے۔

(۵)

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ ... سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ یُقْضٰی یَوْمَ الْقِیَامَةِ عَلَیْهِ رَجُلٌ اسْتُشْهِدَ فَأُتِیَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا، قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِیهَا؟ قَالَ: قَاتَلْتُ فِیكَ حَتّٰی اسْتُشْهِدْتُ قَالَ: كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَنْ یُّقَالَ جَرِیْءٌ فَقَدْ قِیْلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلٰی وَجْهِهِ حَتّٰی أُلْقِیَ فِی النَّارِ.... (مسلم، رقم ۱۹۰۵، رقم مسلسل ۴۹۲۳)

ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ... میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: قیامت کے دن سب سے پہلے اس شخص کا فیصلہ کیا جائے گا جو لڑ کر شہید ہوا تھا۔ وہ خدا کے حضور میں لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا، وہ ان کا اقرار کرے گا تو اللہ پوچھے گا: تو نے یہ نعمتیں پا کر میرے لیے کیا کیا؟ وہ کہے گا: میں نے تیرے لیے جنگ کی، یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹ کہتا ہے، تو نے تو اس لیے جنگ کی تھی کہ لوگ تیری بہادری کا اعتراف کریں، سو یہ ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کے لیے عذاب کا حکم فرمائے گا اور اسے منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا....۔

(۶)

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ غَزَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَهُوَ لَا یُرِیْدُ إِلَّا عِقَالًا فَلَهُ مَا نَوٰی. (نسائی، رقم ۳۱۴۰)

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلا اور (اس کے ساتھ) اس نے اونٹ باندھنے کی ایک رسی پانے کی نیت بھی کر لی تو اسے صرف وہ رسی ملے گی، اس کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہو گا۔

(۷)

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: الْغَزْوُ غَـزْوَانِ فَأَمَّا مَنِ ابْتَغٰى وَجْهَ اللّٰهِ وَأَطَاعَ الْإِمَامَ وَأَنْفَقَ الْكَرِيْمَةَ وَيَاسَرَ الشَّرِيْكَ وَاجْتَنَبَ الْفَسَادَ كَانَ نَوْمُهُ وَنُبْهُهُ أَجْرًا كُلُّهُ وَأَمَّا مَنْ غَزَا رِيَاءً وَسُمْعَةً وَعَصَى الْإِمَامَ وَأَفْسَدَ فِي الْأَرْضِ فَإِنَّهُ لَا يَرْجِعُ بِالْكَفَافِ. (نسائی، رقم ۳۱۹۰، ۴۲۰۰)

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: لڑائیاں دو قسم کی ہیں: جس نے خالص اللہ کی رضا جوئی کے لیے لڑائی کی اور اس میں اپنے حکمران کی اطاعت کی، اپنا بہترین مال خرچ کیا، اپنے ساتھیوں کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کیا اور فساد سے اجتناب کیا تو اس کا سونا جاگنا، سب باعث اجر ہو گا اور جس نے دنیا کو دکھانے اور شہرت اور نام وری کے لیے تلوار اٹھائی اور اپنے حکمران کی نافرمانی کی اور (اس طرح) زمین میں فساد پھیلایا تو وہ برابر بھی نہ چھوٹے گا۔

توضیح:

ان احادیث سے ہمیں درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ اللہ کی راہ میں لڑائی صرف اس کی ہے جو محض اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے میدان جنگ میں اترے۔

۲۔ مالی فائدے اور نام وری کے لیے جنگ کرنے والے کو آخرت میں کچھ بھی حاصل نہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ صرف

اسی عمل کو قبول کرتا ہے جو خالصتاً اس کی رضامندی کے لیے کیا جائے۔

۳۔ جس شخص نے اپنی بہادری کا اعتراف کرانے کے لیے جنگ کی اور پھر وہ شہید ہو گیا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: تو نے تو اس لیے جنگ کی تھی کہ لوگ تیری بہادری کا اعتراف کریں، سو یہ ہو گیا۔ چنانچہ اسے منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

۴۔ جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کی نیت سے نکلا، لیکن اس کے ساتھ اس نے کسی اور چیز کی نیت بھی کر لی تو اسے صرف وہ چیز ہی ملے گی، اس کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہو گا، کیونکہ وہ خالص نیت سے محروم تھا۔

۵۔ جو شخص محض اللہ کی رضا کے لیے جہاد کرتا، اپنے حکمران کی اطاعت کرتا، اللہ کی راہ میں اپنا بہترین مال خرچ کرتا، اپنے ساتھیوں کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کرتا اور فتنہ و فساد سے اجتناب کرتا ہے تو اس کا سونا جاگنا، سب باعث اجر ہوتا ہے۔

۶۔ جو شخص دنیا کو دکھانے اور شہرت و نام وری کے لیے تلوار اٹھاتا، اپنے حکمران کی نافرمانی کرتا اور اس طرح زمین میں فتنہ وفساد پھیلاتا ہے تو وہ قیامت کے دن برابر سرابر کے اعمال پر بھی نہ چھوٹے گا۔

محمد وسیم اختر مفتی

ارقم بن ابوارقم رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

امکان غالب ہے کہ حضرت ارقم ۵۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام عبد مناف تھا لیکن اپنی کنیت ابوارقم سے مشہور ہوئے۔اسد (ابوجندب) ان کے دادا اور عبداللہ پڑدادا تھے۔ارقم قریش کے ذیلی قبیلہ بنومخزوم سے تعلق رکھتے تھے،کعب بن لوی ان کے آٹھویں جد تھے۔ان کی والدہ تماضر بنت حذیم (امیمہ یا صفیہ بنت عبدالحارث) بنو سہم یا بنوخزاعہ (ابن سعد) سے تھیں۔ابوعبیداللہ ان کی کنیت تھی۔

ارقمؓ قریش کے اہل دانش میں سے تھے،اس کا ثبوت حلف الفضول میں ان کی شرکت سے ملتا ہے۔اس عہد نامے کا پس منظر یہ ہے۔ بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مکہ لڑائی جھگڑوں کا مرکز بن چکا تھا۔وہاں کے باشندگان اس صورت حال سے عاجز آچکے تھے کیونکہ ان کے لیے تجارتی سرگرمیاں جاری رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔جنگ فجار (۵۸۵ء) کے بعد شہر کو جھگڑوں سے پاک کرنے کی ضرورت زیادہ محسوس ہونے لگی۔اسی اثنا میں یمن کے شہر زبید سے (بنواسد کا) ایک تاجر مکہ آیا اور بنوسہم کے ایک شخص کو کچھ سامان فروخت کیا لیکن اس نے طے شدہ قیمت دینے سے انکار کر دیا۔تاجر جبل ابوقبیس پر چڑھ گیا اور انصاف کے لیے چلانے لگا تب قریش کے بڑے سرداروں کا عبداللہ بن جدعان کے گھر اجلاس ہو جس میں طے ہوا کہ انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور مظلوموں کو انصاف فراہم کرنے کے لیے مشترکہ کاوشیں کی جائیں۔پھر شرکا نے حجر اسود کے پاس جا کر عہد کیا اور ایک معاہدہ تحریر کر کے خانہ کعبہ کے اندر رکھ دیا۔اس معاہدے کو حلف الفضول کا نام دیا گیا کیونکہ اس میں فضل نام کے تین

حضرات نے حصہ لیا، اس کی دوسری وجہ تسمیہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ یہ معائدہ اہل مکہ کے لیے فضائل کا باعث بنا۔ بنو ہاشم، بنو اسد، بنو زہرہ، بنو حارث اور بنو تیم کے قبائل اس عہد میں شریک ہوئے لیکن بنو نوفل اور بنو امیہ نے حصہ نہ لیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکرؓ، عبداللہؓ بن جدعان اور ارقمؓ بن ابو ارقم حلف الفضول کے ارکان میں شامل تھے۔ حلف الفضول سے عربوں کی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی تو نہ آئی تاہم، ایک مائل بہ جنگ معاشرے میں انصاف کی کرن چمکی، یمن اور دوسرے علاقوں سے مکہ میں تاجروں کی آمد و رفت میں رکاوٹیں کم ہوگئیں۔ اخلاق اسلامی اور حقوق انسانی کی تاریخ میں یہ حلف ایک سنگ میل کے طور پر سامنے آتا ہے۔ آمد اسلام کے بعد بھی کچھ نزاعات اس کی بنیاد پر نمٹائے گئے۔

ارقمؓ کا شمار السابقون الاولون میں ہوتا ہے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کی دعوت پر ایمان لائے، انھی کی نصیحت پر حضرت عثمانؓ مشرف باسلام ہوئے تھے۔ سیدنا عثمانؓ کے خلعت ایمان پہننے کے دوسرے دن ابوبکرؓ ابوعبیدہؓ بن جراح، عثمانؓ بن مظعون، عبدالرحمانؓ بن عوف، ابوسلمہؓ بن عبدالاسد اور ارقمؓ بن ابو ارقم کو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے، سب نے آپ کے دست مبارک پر بیعت ایمان کی۔ نعمت ہدایت پانے والوں میں ارقمؓ کا ساتواں (یا بارہواں) نمبر تھا۔ پہلی روایت کی تائید ارقمؓ کے بیٹے عثمان کے اس قول سے ہوتی ہے، میرے والد اسلام میں داخل ہونے والے ساتویں شخص تھے۔ ارقمؓ کا گھر کوہ صفا کے دامن میں مشرقی جانب ایک تنگ گلی میں تھا، عام لوگوں کو یہاں آنے جانے والوں کی خبر نہ ہوتی۔ ابتدائے اسلام میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اسی گھر میں نشست فرماتے تھے، تب قریش کی طرف سے ایذاؤں کا خطرہ تھا، اس لیے آپ نے مشرکوں سے مخفی رہ کر دعوت حق کو پھیلایا۔ آپ دار ارقمؓ میں حاضر ہونے والے مسلمانوں کو اسلام کی تعلیم دیتے اور یہ باہر جا کر آپ کے ارشادات عام کرتے۔ اس طرح دار ارقمؓ کو پہلا اسلامی مدرسہ یا پہلی مسلم جامعہ کہا جا سکتا ہے۔ ۳ نبوی میں جب اہل ایمان کی تعداد اڑتیس ہوگئی تو ابوبکرؓ نے ایمان کا اظہار کرنے پر اصرار کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابھی ہم قلیل ہیں، ابوبکرؓ اپنی بات پر زور دیتے رہے تو آپ مسلمانوں کو لے کر بیت اللہ کے گرد پھیل گئے۔ ابوبکرؓ کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے، انھوں نے مکہ والوں کو اللہ و رسول کی دعوت دینا شروع کی تھی کہ مشرکین ان پر اور سامعین اہل ایمان پر پل پڑے۔ عتبہ بن ربیعہ نے اپنی بھاری جوتی اتار لی اور ابوبکرؓ کو پیٹنے لگا، ان کے پیٹ پر چڑھ کر جوتے کے کنارے سے ان کے چہرے پر اتنی ضربیں لگائیں کہ منہ سوج کر کپا ہوگیا اور ناک اس میں چھپ گئی۔ اسی دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حمزہؓ بن عبدالمطلب اور ابوبکرؓ کی والدہ ام خیرؓ نے اسلام قبول کیا۔ مخلصین اہل ایمان کی تعداد چالیس

ہو گئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دار ارقمؓ ہی میں بیٹھ کر دعا فرمائی، اے اللہ! تمھیں عمرؓ بن خطاب یا عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں سے جو زیادہ پسند ہے، اس کے ذریعے اسلام کو عزت بخش۔ یہ بدھ کا دن تھا، اگلے ہی روز یعنی جمعرات کو عمرؓ بن خطاب نے گلے میں تلوار لٹکا کر دار ارقمؓ کا رخ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور چالیس کے قریب صحابہؓ یہاں جمع تھے۔ عمرؓ کا ارادہ سب کو قتل کرنے کا تھا، راستے میں نُعیمؓ بن عبداللہ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا، تمھاری بہن فاطمہؓ اور بہنوئی سعیدؓ بن زید مسلمان ہو کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو ہو چکے ہیں، پہلے ان کی خبر لو۔ عمرؓ نے جا کر ان کو مارا پیٹا لیکن سورۂ طٰہٰ کی آیات سننے کے بعد دل پلٹ گیا۔ اب وہ مسلمان ہونے کے ارادے سے نکلے، خبابؓ بن ارت سے ملاقات ہوئی اور پھر دار ارقمؓ پہنچ گئے۔ عمرؓ مشرف باسلام ہوئے تو یہاں موجود مسلمان باہر نکلے، نعرۂ تکبیر بلند کیا اور بلا جھجک کھلم کھلا بیت اللہ کا طواف کیا۔ ۳ نبوی (۶ نبوی، ہجرت حبشہ کے بعد: ابن کثیر) میں حمزہؓ و عمرؓ کے مسلمان ہونے سے اہل ایمان کو تقویت مل گئی تو اللہ کی طرف سے حکم نازل ہوا، فاصدع بما تؤمر ۔جس (دین متین کی تبلیغ) کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے ہانکے پکارے کہہ دیجیے۔ (سورۂ حجر: ۹۴) تب دار ارقمؓ کو دار اسلام کہا جانے لگا۔

ارقمؓ مدینہ کو ہجرت کرنے والے اولین مسلمانوں میں شامل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارقمؓ اور زیدؓ بن سہل (ابوطلحہؓ) یا عبداللہؓ بن اُنیس (ابن کثیر) میں مواخات قائم فرمائی۔ آپ نے دوسرے صحابہؓ کی طرح انھیں بھی مدینہ میں گھر تعمیر کرنے کے لیے قطعۂ زمین عنایت فرمایا۔

ارقمؓ بن ابوارقم نے جنگ بدر میں شرکت کی، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت میں سے انھیں ایک تلوار عنایت فرمائی۔ مالک بن ربیعہ کہتے ہیں، مجھے جنگ بدر کے دن بنومخزوم کی شاخ بنوعایذ کی تلوار ملی جو مرزبان کے نام سے مشہور تھی۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت جمع کرانے کا حکم دیا تو میں نے اسے غنیمتوں کے ڈھیر میں ڈال دیا۔ اس میں سے جس نے جو چیز مانگی آپ نے دے دی۔ اس تلوار کو ارقمؓ نے پہچان کر مانگ لیا تو آپ نے انھیں دے دی۔ ارقمؓ جنگ احد، جنگ خندق اور باقی تمام غزوات میں بھی آپ کے شانہ بشانہ شریک رہے۔ آپ نے صدقات جمع کرنے کے لیے انھیں عامل بھی مقرر کیا۔

ارقمؓ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، ان کا شمار ان چند صحابہ میں ہوتا ہے جنھوں نے کتابت وحی کی۔ ان کی نمایاں تحریر وہ خط ہے جو انھوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر قبیلۂ بنومحارب کے عُظیم بن حارث کو لکھا۔ ابن عسا کر نے اس کا متن نقل کیا ہے، ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ خط محمد رسول اللہ کی جانب سے عُظیم بن حارث محاربی کو تحریر کیا جاتا

ہے۔(ملک ہذیل کی وادی نخلہ کا) فخ کی گھاٹی سے لے مجمعہ تک کا چشمہ اسے دیا جاتا ہے۔اس سرزمین میں کوئی اس کے ساتھ نزاع نہیں کرے گا۔ یہ کچھ اور قطعات اراضی ہیں جو فلاں فلاں اشخاص کو دیے جاتے ہیں۔'' کوشش کے باوجود ہمیں پتا نہیں چل سکا کہ یہ خط کب اور کس غرض سے لکھا گیا کیونکہ ابن عساکر کے علاوہ کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا، انھوں نے بھی سیاق وسباق نہیں بتایا۔تاریخ اسلامی کے مطالعہ سے محض اتنا معلوم ہوتا ہے کہ غطفان کے ذیلی قبائل بنومحارب اور بنوثعلبہ غزوۂ ذات الرقاع (۴ھ) میں نخل یا نخلہ کی وادی میں مسلمانوں کے مقابلہ پر آئے تھے۔بنوغطفان جنگ خندق (شوال ۵ھ) میں بھی مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہوئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے ایک تہائی باغات کے پھلوں کے بدلے میں ان سے صلح کا معاہدہ تحریر کرایا لیکن سعدؓ بن معاذ کے مشورے پر اسے نافذ نہ فرمایا۔غطفان کی دیگر مہم جوئیوں کا بیان بھی ملتا ہے لیکن بنومحارب اور عُظیم بن حارث کا کہیں تذکرہ نہیں۔بنومحارب ۱۰ھ میں مسلمان ہوئے۔

ابن حزم نے ارقمؓ کو اصحاب ثلاثہ (وہ اصحاب رسول جن سے تین مرفوع احادیث روایت ہوئی ہوں) میں شمار کیا ہے۔ان کے بیٹے عثمانؓ اور پوتے عبداللہ بن عثمانؓ نے ان سے احادیث روایت کی ہیں۔

ارقمؓ بن ابوارقم نے بیت المقدس جانے کا ارادہ کیا اور سفر کی تیاری مکمل کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت چاہنے کے لیے آئے۔آپ نے دریافت فرمایا، سفر پر کیوں جا رہے ہو؟ کوئی ضرورت یا تجارت اس کا باعث بنی ہے؟ انھوں نے جواب دیا، یا نبی اللہ! میرے باپ آپ پر فدا ہوں، میری نیت ہے کہ بیت المقدس میں نماز پڑھوں۔آپ نے فرمایا، ''میری اس مسجد (نبوی) میں ادا کی گئی نماز مسجد حرام کے سوا باقی تمام مسجدوں کی نماز سے ایک ہزار گنا زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔'' ارقمؓ نے یہ ارشاد سنا تو بیٹھ رہے اور سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔

ایک اور مشہور حدیث رسول ارقمؓ کی روایت کردہ ہے، ''اس شخص کی مثال جو جمعہ کے دن امام کا خطبہ شروع کرنے کے بعد لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا، ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے دو افراد کو ہٹاتا ہوا مسجد میں داخل ہوتا ہے ایسے ہے گویا کوئی اپنی انتڑیوں کو جہنم کی آگ میں گھسیٹ رہا ہو۔

مشہور روایت ہے کہ ارقمؓ کے والد نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ابن ابی خیثمہ نے انھیں اہل ایمان میں شمار کیا ہے لیکن ابن عبدالبر نے ان کی رائے کو غلط قرار دیا ہے۔ابوحاتم رازی نے عبیداللہ کے بجائے عبداللہ بن ارقم کو ارقمؓ بن ابوارقم کا بیٹا بتایا ہے، ابن عبدالبر کہتے ہیں، یہ بھی ایک سہو ہے، اس کی وجہ یہ رہی کہ ارقمؓ بن ابوارقم نام کے دو صحابہ تھے، ایک بنومخزوم کے ارقمؓ جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں دوسرے بنوزہرہ کے ارقمؓ بن ابوارقم زہری۔عبداللہ ارقم زہری کے

بیٹے تھے۔

خلیفۂ دوم عمرؓ بن خطاب نے ارقمؓ کے ماموں نافعؓ بن عبدالحارث کو مکہ کا گورنر مقرر کیا۔ ارقمؓ عہد عثمانیؓ میں بیت المال کے نگران بھی رہے۔

ارقمؓ بن ابوارقم کی وفات کے بارے میں دو روایتیں ہیں جن میں بیان کردہ سن وفات میں بہت تفاوت ہے۔ ابونُعیم کی روایت کے مطابق وہ ۱۳ھ (۶۳۴ء) میں فوت ہوئے جس دن خلیفۂ اول ابوبکرؓ نے وفات پائی۔ ابن مندہ کہتے ہیں کہ انھوں نے عہد معاویہؓ میں ۵۵ھ (۶۷۵ء) یا ۵۳ء (۶۷۳ء) میں وفات پائی، ابوبکرؓ کی وفات بھی اسی دن ہوئی۔ ارقمؓ کی وصیت کے مطابق جنازہ سعدؓ بن ابی وقاص نے پڑھایا۔ سعدؓ اس وقت مدینہ کی نواحی بستی عقیق میں واقع اپنے گھر میں تھے۔ مدینہ کے اموی گورنر مروان نے کہا، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی کی میت کو ایک غائب شخص کے لیے روک رکھا جائے؟ وہ خود جنازہ پڑھانا چاہتا تھا لیکن ارقمؓ کے بیٹے عبیداللہؓ نہ مانے۔ بنومخزوم نے ان کا ساتھ دیا۔ اس موقع پر تلخ کلامی بھی ہوئی، سعدؓ آن پہنچے تو قضیہ ختم ہوا۔ اس حساب سے ان کی عمر تراسی (یا پچاسی) سال ہوئی۔ ابن عبدالبر نے دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق کی ہے کہ سعدؓ کے والد ابوارقم اور ابوبکرؓ ۱۳ھ (۶۳۴ء) میں ایک ہی دن فوت ہوئے جب کہ ارقمؓ کی وفات ۵۵ھ (۶۷۵ء) میں عہد معاویہؓ میں ہوئی۔ اس طرح ابن ابی خیثمہ کا قول درست ثابت ہو جاتا ہے کہ ابوارقمؓ مسلمان ہوئے اور انھیں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف بھی حاصل رہا۔

ارقمؓ بن ابوارقم کی اولاد نرینہ دو باندیوں سے ہوئی، ایک ام ولد سے عبیداللہؓ اور دوسری سے عثمانؓ نے جنم لیا۔ بنواسد بن خزیمہ کی ہند بنت عبداللہ سے امیہ اور مریم پیدا ہوئیں۔ ایک اور ام ولد سے صفیہ کی ولادت ہوئی۔ ابن سعد کہتے ہیں، عثمان بن ارقمؓ سے ارقمؓ کی نسل آگے چلی جب کہ عبیداللہؓ کی اولاد میں سے کوئی نہ بچا کہ سلسلہ چلتا۔

ارقمؓ نے اپنی زندگی ہی میں اپنا گھر بیٹے کو تحفۃً دے دیا اور تاکید کی کہ اسے نہ بیچنا۔ ابن سعد کہتے ہیں، میں نے خود دارارقمؓ میں تحفے کی یہ دستاویز دیکھی ہے۔ اس میں تحریر تھا، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، وہ گھر (یا قطعۂ اراضی) جو صفا میں ہے، اس کے بارے میں ارقمؓ کا فیصلہ ہے کہ حرم کے پاس ہونے (اور ابتدائے عہد نبوت میں اس گھر کے اہم ہونے) کی وجہ سے اسے حرمت دی جائے، بیچا جائے نہ وراثت میں منتقل کیا جائے۔ تحریر پر دو اشخاص ہشام بن عاص اور اس کے آزاد کردہ غلام کی گواہی ثبت تھی چنانچہ گھر اسی حالت میں قائم رہا، اس میں ایک قبہ (یا مسجد) بھی تھا۔ ارقمؓ کی اولاد اس میں رہتی رہی یا اسے کرایے پر اٹھاتی رہی لیکن جب یہ ان کے پوتوں کے ہاتھ آیا تو انھوں نے دوسرے

عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کے آگے فروخت کر دیا۔ ارقمؓ کے پوتے عمران بن عثمانؒ بیان کرتے ہیں، مجھے وہ دن یاد ہے جب ابوجعفر کے دل میں دارارقمؓ ہتھیانے کا خیال آیا۔ ایام حج میں وہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کر رہا تھا۔ ہم گھر کی چھت پر نصب خیمے میں بیٹھے تھے، ہمارے نیچے اتنے قریب سے گزرا کہ میں چاہتا تو اس کی ٹوپی اتار لیتا۔ مروہ سے اترتے اور کوہ صفا پر چڑھتے ہوئے وہ ہمیں دیکھتا رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرت حسنؓ کے پڑپوتے محمد بن عبداللہ نے منصور کے خلاف بغاوت کی تو اس نے انھیں قتل کرا دیا۔ ارقمؓ کے دوسرے پوتے عبداللہ بن عثمانؒ محمد بن عبداللہ کے ساتھی تھے لیکن بغاوت میں حصہ نہ لیا تھا، اس کے باوجود ابوجعفر نے انھیں بیڑیوں میں جکڑنے کا حکم دے دیا۔ پھر کوفہ سے ایک شخص شہاب بن عبدرب ان کے پاس آیا اور کہا، اگر تم دارارقمؓ بیچ دو تو میں تمھیں بیڑیوں سے چھڑا سکتا ہوں۔ عبداللہ کی عمر اسی برس سے تجاوز کر چکی تھی اور وہ قید و بند سے عاجز آئے ہوئے تھے۔ پھر بھی انھوں نے کہا، یہ گھر صدقہ کیا ہوا ہے، میرا اس میں صرف ایک حصہ ہے، بقیہ میں میرے بھائی بہن شریک ہیں۔ شہاب نے کہا، آپ اپنا حصہ دے دیں تو ہم آپ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ناچار ہو کر وہ سترہ ہزار دینار لے کر گھر سے دست بردار ہو گئے۔ ان کے بھائی بہنوں کو بڑی رقوم ملیں تو وہ بھی اپنے حصے فروخت کر کے چلتے بنے۔ اس طرح دارارقمؓ ابوجعفر منصور کے ہاتھ آ گیا۔ منصور کے بعد اس کا بیٹا مہدی خلیفہ بنا تو اس نے اپنی بیوی (اور باندی)، موسیٰ اور ہارون الرشید کی والدہ خیزران کو تحفے میں دے دیا جس نے اس کی تعمیر نو کی اور یہ بیت الخیز ران کہلانے لگا۔ مہدی کا پوتا جعفر بن موسی خلیفہ بنا تو دارارقمؓ اس کے پاس آ گیا، اس میں مصر کے شطوی اور یمن کے عدنی بھی رہتے رہے۔ آخر کار اسے موسیٰ بن جعفر کی اولاد میں سے غسان بن عباد نے خرید لیا۔ شاہ عبدالعزیز کے دور حکومت میں حرم کی پہلی سعودی توسیع ہوئی تو مسعی (صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کا راستہ) پر چھت ڈال کر دارارقمؓ کو اس میں شامل کر لیا گیا۔ دارارقمؓ بظاہر دنیا میں موجود نہیں رہا تاہم اس کی یاد زندہ اور تاریخ تابندہ ہے۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویہ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، معجم الصحابہ (ابن قانع)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ (ابن اثیر)، تاریخ دمشق الکبیر (ابن عساکر)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، سیر اعلام النبلا (ذہبی)، البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)، الاصابہ فی تمییز الصحابہ (ابن حجر)، تہذیب التہذیب (ابن حجر)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ: Montgomery Watt)

الطاف احمد اعظمی

اسلام اور جمہوریت

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(۲)

یہ بات بھی میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسلام کو بادشاہ سے کوئی کد نہیں۔ بادشاہ کو عادل ہونا چاہیے، شریعت کا پابند ہونا چاہیے۔ خلیفہ ہے تو وہ اللہ کے قانون کو، شریعت کو جاری کرنے والا ہو اور شوریٰ کا پابند ہو۔ شوریٰ کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے قانون کے تابع ہو اور اجتہاد پر مبنی ہو۔ اجتہاد کے لیے ضروری ہے کہ اہل علم، اہل استنباط اور اہل الرائے اس کے ممبر ہوں۔[۲۷]''

راقم کا خیال ہے کہ جمہوریت کے بارے میں اوّل الذکر گروہ غلطی پر ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت بطور ایک سیاسی نظام کے عین اسلام ہے وہ جمہوریت کے فلسفہ اور اس کی تاریخ سے پورے طور پر واقف نہیں ہیں۔ انھوں نے یہ دیکھ کر کہ جمہوریت میں آمریت کے برخلاف حکمران کا انتخاب ہوتا ہے اور اس میں خاص و عام سب شریک ہوتے ہیں اور ہر شخص کو آزادیِ فکر و عمل حاصل ہے، گمان کر لیا کہ یہ عین اسلامی طرز حکومت ہے۔

لیکن یہ محض جزئی مشابہت ہے۔ یہ اسی طرح کی مشابہت ہے جو اسلام کے نظریۂ معیشت اور سوشلزم میں ہے کہ دونوں ہی نظام ارتکازِ زر کے خلاف ہیں۔ اس جزئی مشابہت کو دیکھ کر بعض اہلِ علم نے خیال کیا کہ اسلام سوشلزم

۲۷ تدبّر، لاہور پاکستان، ماہ جون ۲۰۰۴ء، ص ۴۹

کا حامی ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح وضع کر لی۔ جس طرح یہ بات غلط ہے، اسی طرح پہلی بات بھی غلط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا ایک اپنا منفرد سیاسی نظام ہے جو مشاورت کے اصول پر مبنی ہے[۲۸]۔ یہ شورائی نظام تمام مادّی نظامات سے بالکل الگ ہے۔ وہ ایک خدا پرستانہ نظام ہے جس میں خدا کی حاکمیت کا تصور مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں مادّہ اور روح دونوں کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ریاست کے امور عقل اور وحی دونوں کی رہ نمائی میں انجام دیے جاتے ہیں، جب کہ جمہوریت کے سیاسی فلسفہ میں روحانیت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، وہ ایک خالص مادّہ پرستانہ سیاسی نظام ہے اور اس میں عوام ہی حاکم اور قانون ساز ہوتے ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

جمہوریت کا جائزہ، اسلامی نقطۂ نظر سے

میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ دوسرے عصری مادّی نظامات کے مقابلے میں جمہوریت اپنے متعدد نقائص کے باوجود قابلِ ترجیح ہے اور اہل دنیا کے لیے ایک مفید سیاسی نظام ہے۔ لیکن اہلِ اسلام کے لیے جمہوریت میں کشش کا کوئی سامان نہیں ہے، اور کیوں کر اس طرف ان کا میلان ہو سکتا ہے کہ وہ مادّی طرز فکر کی ترجمان ہے۔ یہ اس لیے بھی قابلِ ترجیح نہیں ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام ہر پہلو سے جمہوریت سے فائق ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں جمہوریت کے عناصرِ ترکیبی کا جائزہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے لوں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ جمہوریت اور اسلام کے بعض اصولوں میں جو مشابہت نظر آتی ہے وہ بالکل ظاہری مشابہت ہے، فی الواقع ان میں مغائرت ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو کہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں میں جو نقائص ہیں اور ان کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے، ان سے اسلام کا سیاسی نظام پاک ہے۔

(۱) حاکمیتِ عوام: اسلامی نقطۂ نظر سے جمہوریت کی سب سے بڑی نظری خامی اس کا تصوّرِ حاکمیت ہے، یعنی یہ خیال کہ عوام ہی اصل فرماں روا، حاکم اور قانون ساز ہیں۔

اسلام کے سیاسی نظام میں حاکمیتِ عوام کے بجائے حاکمیتِ الٰہ کا تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں کسی انسان کو خواہ اس کا تعلق طبقۂ عوام سے ہو یا خواص سے، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ حاکم بن کر دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اس میں عوام تو کجا، علماء و مشائخ کو بھی ''ارباب من دون اللّٰہ'' بننے کا حق نہیں دیا گیا ہے۔

حکومت کرنے کا حق صرف اس خدائے ذوالجلال کو حاصل ہے جو انسانوں کا خالق و مالک اور ان کا پروردگار ہے۔ وہی اصلی حاکم ہے اور بقیہ سارے انسان اس کے بندے اور تابعِ فرمان ہیں۔

جن لوگوں کے ہاتھ میں سیاسی نظام کی باگ ڈور ہوتی ہے ان کی حیثیت حاکم کی نہیں بلکہ اصلی حاکم کی طرف سے بندوں کے اجتماعی معاملات کے نگراں اور منتظم کی ہے۔ ان کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ خود حاکمِ کائنات کی مرضی کے مطابق چلیں اور بندگانِ خدا کو بھی اس کے احکام وقوانین کے مطابق جو اس کی آخری کتاب میں دیے گئے ہیں، چلائیں اور عدل وانصاف کے ساتھ ان کے معاملات کی دیکھ بھال کریں۔ اسلام میں حکومت ایک امانت ہے اس لیے اس کا حق وہی لوگ ادا کر سکتے ہیں جو امین ہوں۔

انسان کی فطرت اس بات سے ابا کرتی ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی کرے، خواہ یہ غلامی استبدادِ شخصی کی صورت میں ہو یا جمہوریت کے خوش نما لباس میں۔ اسلام کے سیاسی نظام کے سوا کوئی دنیوی نظام ایسا نہیں ہے جو انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دے سکے۔

(۲) انفرادی آزادی: جمہوریت میں انفرادی آزادی کو بہت اہمیت حاصل ہے، لیکن اس کا مطلب مطلق آزادی نہیں، جیسا کہ جمہوریت کے نادان حامی خیال کرتے ہیں اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ مطلق آزادی کا مطلب فکری اور عملی انارکی ہے اور اس سے معاشرے میں فتنہ وفساد پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ ایشیاء اور افریقہ کے جمہوری ملکوں میں اس بے قید آزادی کے اندوہ ناک مظاہر اکثر وبیشتر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں ہندوستان میں دلّی اور ملک کے دوسرے حصوں میں سکّھوں کے ساتھ ہونے والا انسانیت سوز سلوک، ۲۰۰۲ء میں گجرات کے مسلمانوں کا قتلِ عام، اور ابھی حال ہی میں اڑیسہ کے عیسائیوں کی جان ومال کی بربادی اسی بے قید آزادی کے مہلک نتائج ہیں۔

اسلامی نظام میں کسی شخص یا گروہ کو اس نوع کی مطلق آزادی حاصل نہیں ہے۔ یہاں آزادی کا مفہوم اور اس کی حدود بالکل واضح ہیں۔ آزادی کا مطلب قوانین کے دائرہ میں رہ کر عمل کی آزادی ہے۔ قانون کی حد سے آگے قدم بڑھاتے ہی یہ آزادی مسلوب ہو جاتی ہے۔

اسلامی نظام میں ہر شخص کو خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، مذہب وعقیدہ، تنظیم واجتماع بشرط یہ کہ اچھے کاموں کے

۲۸؎ اس کو جمہوریت کے بالمقابل ''شورائیت'' کہہ سکتے ہیں، بشرط یہ کہ یہ اصطلاح عربی قواعد کے لحاظ سے صحیح ہو۔ اس کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے ''اللہ کی حکومت، اہل الرّاے مومنوں کے ذریعہ، لوگوں کے فائدے کے لیے۔''

لیے ہو، نہ کہ شر وفساد پھیلانے کے لیے، اور کسبِ معاش کی پوری آزادی اور یکساں مواقع حاصل ہیں۔ متانت اور تہذیب کے دائرے میں رہ کر اظہارِ خیال اور اختلافِ رائے کا حق بھی سب کو حاصل ہے۔ اس میں مالک اور نوکر اور مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں ہے۔

عہدِ نبوی کا واقعہ ہے کہ ایک عورت کو جب اس کے شوہر نے مارا تو اس نے کھلے عام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر اپنے شوہر کی شکایت کی (سورۂ مجادلہ:۱)۔ ایک بار کسی بات پر حضرت عمر کی بیوی نے ان کو پلٹ کر جواب دیا تو انھوں نے کہا، اب تمہارا یہ رتبہ ہوگیا، وہ بولیں کہ تمہاری بیٹی تو رسول اللہ سے دوبدو ایسی باتیں کرتی ہے۔[۲۹]

یہ اظہارِ رائے کی آزادی ہی تھی کہ ایک مرتبہ خلیفۂ دوم نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا: اسمعوا واطیعوا ''سنو اور مانو'' تو ایک شخص نے بے باکی کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا: نہیں، پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ جو لباس پہنے ہوئے ہیں وہ کیسے بنا؟ جب خلیفہ کے فرزند عبداللہ بن عمر نے ان کی طرف سے تسلّی بخش جواب دے دیا تو اس نے کہا، ہاں اب کہو، ہم سنیں گے اور مانیں گے۔[۳۰] اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عمر تقریر کر رہے تھے کہ ایک شخص کھڑا ہو گیا اور بولا: اتق اللّٰہ یا عمر ''اے عمر، خدا سے ڈرو۔'' حاضرینِ مجلس کو یہ بات گراں گزری اور ان میں سے ایک شخص نے اس کو خاموش کرنے کی کوشش کی تو خلیفہ نے کہا، اس کو کہنے دو، اگر یہ لوگ نہ کہیں تو ان کا کیا فائدہ اور ہم ان کی نہ سنیں تو ہماری کیا ضرورت۔''[۳۱]

(۳) مساوات: جمہوریت میں جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، سب لوگ خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، گورے ہوں یا کالے، پیدائش کے اعتبار سے مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مذہب، جنس اور رنگ ونسل کی بنیاد پر ان کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہر شخص اپنی قابلیت اور سعی وجہد سے حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ منصب پر فائز ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قانون کی نظر میں ہر آدمی مساوی حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن مساوات کے یہ سارے جمہوری دعوے محض کاغذی زینت ہیں، عمل کی دنیا میں ان میں سے ایک دعویٰ بھی آج تک حقیقت کا جامہ نہیں پہن سکا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیشتر جمہوری ملکوں میں سماج کے کمزور طبقات اور اقلیتوں کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ چوں کہ جمہوریت میں اکثریت کی حکومت کا قاعدہ چلتا ہے اس لیے جو طبقہ تعداد میں زیادہ ہوتا ہے وہ سماج کے ان طبقات کے ساتھ جو تعداد میں کم ہوتے ہیں، ناروا سلوک کرتا ہے، ان کو خود سے حقیر اور کم تر سمجھ کر ان کے خلاف ہر طرح کی زیادتی کو جائز سمجھتا ہے۔ ان کی جان و مال اور آبرو کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اتنا ہی نہیں، اقلّیت کی زبان کو مٹانے، ان کی تہذیبی اقدار کی بیخ کنی کرنے، ان کے ملّی تشخّص اور

تہذیبی امتیازات کو اکثریت کے تہذیبی دھارے میں ضم کرنے کو وہ اپنا قومی اور ملکی فریضہ سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں دلتوں اور مسلمانوں اور امریکہ میں کالوں کے ساتھ ہونے والا امتیازی سلوک جمہوریت کی نظری مساوات کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہے۔

اسلام کا تصوّرِ مساوات اس عیب سے بالکل پاک ہے۔ وہ ایک متوازن تصوّرِ مساوات ہے، جس میں منافقت کا ادنیٰ شائبہ شامل نہیں ہے۔ اس تصوّرِ مساوات میں اس بات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے کہ سارے انسان باعتبارِ پیدائش مساوی ہیں۔ فرمایا ہے:

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً الخ (سورۂ نسآء ۴:۱)

”اے لوگو، اپنے اس رب کی نافرمانی سے بچو، جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا، اور پھر دونوں (کے اتّصال) سے بہت سے مرد اور عورت (بنا کر روئے زمین پر) پھیلا دیے۔“

ظاہر ہے کہ جب تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں تو پھر ان کے درمیان رنگ و نسل اور زبان اور مذہب کی بنیاد پر امتیاز کرنے کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے۔ رنگ و نسل اور زبان کا اختلاف فروعی حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ ان کا تعلق پیدائش سے نہیں بلکہ جغرافیائی حالات سے ہے۔ اسلام میں ہر شخص خواہ وہ سیاہ فام ہو یا سفید فام، عورت ہو یا مرد، عجمی ہو یا عربی، مالک ہو یا نوکر، یکساں عزت و احترام کا مستحق ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

”اے لوگو، تم سب کا رب ایک ہے، کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر، اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی برتری نہیں ہے مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہو۔“[۳۲]

اسی طرح حقوق اور سماجی حیثیت کے معاملے میں جنس کی بنیاد پر کوئی تفریق و امتیاز روا نہیں ہے۔ فرمایا:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ. (بقرہ ۲:۲۲۸)

”ان کے (یعنی عورتوں کے) لیے وہی حقوق ہیں جو مردوں کے عورتوں پر ہیں۔“

---

۲۹ الفاروق، علامہ شبلی نعمانیؒ، حصہ دوم، ص ۲۸۶

۳۰ سیرت العمرین، ابن جوزیؒ، ص ۱۲۷، مزید دیکھیں، عمر فاروق اعظم محمد حسین ہیکل، مترجم، حبیب اشعر، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۵۹۰

۳۱ کتاب الخراج، قاضی ابو یوسفؒ، ص ۷، مزید دیکھیں، سیرت العمرین، ص ۱۲۷

دوسری جگہ فرمایا ہے:

لَآ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ج بَعۡضُکُمۡ مِّنۡ ط بَعۡضٍ. (سورۂ اٰل عمران:۱۹۵)

''میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو خواہ مرد ہو یا عورت، ضائع نہیں کروں گا، تم سب آپس میں ایک ہو (یعنی ایک ہی جنس سے تعلق رکھتے ہو)۔''

کنیزوں سے نکاح کے ذکر میں فرمایا ہے:

وَمَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ مِنۡکُمۡ طَوۡلًا اَنۡ یَّنۡکِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ مِّنۡ فَتَیٰتِکُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ط وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاِیۡمَانِکُمۡ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡ م بَعۡضٍ . (سورۂ نسآء:۲۵)

''اور تم میں سے جس کو یہ مقدرت حاصل نہ ہو کہ وہ آزاد مومنہ عورت سے نکاح کر سکے تو وہ ان مومنہ لونڈیوں سے جو تم لوگوں کی مملوکہ ہوں، نکاح کر لے، اللہ کو تمھارے ایمان کی خوب خبر ہے، تم سب آپس میں ایک ہو۔''

انسانی مساوات کی یہ اعلیٰ تعلیم محض کوئی نظری معاملہ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں جو اسلامی معاشرہ وجود میں آیا وہ مساوات کی مذکورہ بالا تعلیم پر مبنی تھا۔ اس میں پیدائشی اعتبار سے کوئی پست و بلند نہیں تھا۔ امیر و غریب اور آقا و غلام سب آپس میں بھائی تھے۔ سب کو دنیوی اور دینی ترقی کے یکساں مواقع حاصل تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو لشکر شام کی طرف بھیجا گیا اس کے کمانڈر ایک نوعمر صحابی اسامہ بن زید تھے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے فرزند۔ اس لشکر کی روانگی کا حال ایک اسلامی مؤرّخ کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

> ''حضرت اسامہ گھوڑے پر سوار تھے اور جانشینِ رسول (خلیفہ) پیادہ پا گھوڑے کے ساتھ دوڑ رہے تھے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف لگام تھامے ہوئے تھے۔ اسامہ نے کہا، اے جانشینِ رسول! آپ بھی سوار ہو لیں، ورنہ مجھے اترنے کی اجازت دیں۔ فرمایا، نہ میں خود سوار ہوں گا اور نہ تم کو اترنے کی اجازت دوں گا۔ یہ تعلیم اس بنا پر تھی کہ کوئی نوعمروں اور غلام زادوں کو حقیر نہ سمجھے۔[۳۲]''

حضرت عمر کے سفر شام کا حال بیان کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ ''حضرت علی کو مدینہ کی خلافت

۳۲؎ بیہقی

دی اور خود ایلہ کو روانہ ہوئے۔ یُرفا ان کا غلام اور بہت سے صحابہ ساتھ تھے۔ ایلہ کے قریب پہنچے تو کسی مصلحت سے اپنی سواری غلام کو دی اور خود اس کے اونٹ پر سوار ہوئے۔ راہ میں جو لوگ دیکھتے تھے، پوچھتے تھے کہ امیر المومنین کہاں ہیں؟ فرماتے کہ ''تمہارے آگے''۔[۳۴]

مساوات کی اسلامی تعلیم پر اس وقت بھی عمل کیا گیا جب اسلامی معاشرے میں بہت سی خرابیاں آ گئی تھیں۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ عہدِ عباسی کے نامور خلفاء مامون الرشید (۸۱۳-۸۳۳) اور معتصم (۸۳۳-۸۴۲) لونڈیوں کے بطن سے تھے۔[۳۵] مصر و شام میں ۱۲۵۰ سے ۱۳۸۲ تک جن مسلمانوں نے حکومت کی وہ غلام یعنی مملوک تھے۔[۳۶]

ہندوستان میں پہلی اسلامی حکومت قائم کرنے والا قطب الدین ایبک (۱۲۰۶-۱۲۱۰) سلطان شہاب الدین غوری (۱۲۰۲-۱۲۰۶) کا غلام تھا۔ قطب الدین کے بعد جو لوگ تخت حکومت پر بیٹھے وہ سب غلام تھے۔ یہ دور جو تقریباً ایک سو سال پر محیط ہے، تاریخ میں عہدِ غلاماں (The Slave Period) کے نام سے مشہور ہے۔

اسلام کے تصورِ مساوات میں تیسری چیز جو نمایاں حیثیت رکھتی ہے وہ قانونی مساوات ہے، یعنی سارے لوگ خواہ ان کا تعلق سماج کے کسی طبقہ سے ہو، قانون کی نظر میں مساوی ہیں۔ اور اس کی مثالیں اسلامی تاریخ میں بکثرت ہیں۔ ایک بار قبیلۂ قریش کی ایک عورت فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو مسلمانوں نے اسامہ بن زید کے توسّط سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کرائی کہ عورت کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں۔ آپ نے فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ لو سرقت فاطمة بنت محمد لقطعت یدھا.[۳۷]

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمد نے چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔''

خلیفۂ دوم کے عہد کا واقعہ ہے کہ مصر کے گورنر عمرو بن العاص کے صاحب زادے محمد بن عمرو نے ایک قبطی مصری کو محض اس بنا پر تازیانے مارے کہ گھوڑ دوڑ میں اس کا گھوڑا آگے نکل گیا تھا۔ خلیفہ کو جب اس زیادتی کی خبر ملی تو باپ اور بیٹے دونوں کو مدینہ طلب کیا اور مصری کے ہاتھ میں کوڑا دے کر فرمایا: ''مار شریفوں[۳۸] کے بیٹے کو۔'' صاحب زادے کی پٹائی کے بعد فرمایا ''عمرو بن العاص کی چندیاں پر بھی درّے لگا، کیوں کہ خدا کی قسم اس نے اس کی حکومت ہی کے بل پر تجھے مارا ہے۔'' مگر مصری نے کہا کہ امیر المومنین، جس نے مجھے مارا تھا میں نے اس سے بدلہ لے لیا اور میرا

۳۳۔ تاریخ اسلام، مولانا ابوالمکارم فضل الوہاب، کلکتہ ۱۹۳۶ (طبع پنجم)، حصّہ دوم، ص ۱۸، ۱۹، مزید دیکھیں، سیرت حضرت ابوبکر، محمد حسین ہیکل

کلیجہ ٹھنڈا ہوگیا۔[39]' اس موقع پر خلیفہ نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

منذ کم تعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا[40]	''تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنالیا ہے حالاں کہ ان کی ماؤں نے انھیں آزاد جنا تھا۔''

حضرت عمر ہی کے دورِ خلافت کا واقعہ ہے کہ جبلہ بن الایہم غسانی نے ایک بدّو کو تھپڑ مار دیا۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا اور معاملہ خلیفہ تک پہنچا۔ انھوں نے بدّو کے بدلے کو درست قرار دیا۔ اس فیصلے پر غسّانی نے ناراضی کا اظہار کیا اور کہا ''امیر المومنین، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ ایک عام آدمی ہے اور میں اپنے علاقے کا بادشاہ ہوں۔ خلیفہ نے فرمایا ''اسلام نے دونوں کو بھائی بنا دیا ہے، اب تم صرف تقویٰ کے ذریعہ سے اس پر فضیلت حاصل کر سکتے ہو، کسی اور صورت میں نہیں[41]۔

علامہ شبلی نعمانی نے ''کنزل العمال'' کے حوالے سے اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے:

''جبلہ بن الایہم غسانی شام کا مشہور رئیس بلکہ بادشاہ تھا اور مسلمان ہوگیا تھا۔ کعبے کے طواف میں اس کی چادر کا ایک گوشہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آ گیا۔ جبلہ نے اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا۔ اس نے بھی برابر کا جواب دیا۔ جبلہ غصّے سے بے تاب ہوگیا اور حضرت عمر کے پاس آیا۔ حضرت عمر نے اس کی شکایت سن کر کہا، تم نے جو کچھ کیا اس کی سزا پائی۔ اس کو سخت حیرت ہوئی اور کہا کہ ہم اس رتبہ کے لوگ ہیں کہ کوئی شخص ہمارے ساتھ گستاخی سے پیش آئے تو قتل کا مستحق ہوتا ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا، جاہلیت میں ایسا ہی تھا۔ لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کر دیا۔ اس نے کہا کہ اگر اسلام ایسا مذہب ہے جس میں شریف و ذلیل کی کچھ تمیز نہیں تو میں اسلام سے باز آتا ہوں۔ غرض وہ چھپ کر قسطنطنیہ چلا گیا[42]۔''

خود خلیفۂ دوم نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن بن عمر پر شراب نوشی کے جرم میں حد جاری کر کے حاکم اور رعایا کے درمیان قانونی مساوات کی ایک ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر تاریخ کے صفحات پیش کرنے سے قاصر ہیں[43]۔ جمہوریت کے علم بردار قانون کی نظر میں مساوات (equality before the law) کا بہت چرچا کرتے ہیں، لیکن کیا وہ

۳۴؎ الفاروق، حصہ اوّل، ص ۱۶۴

۳۵؎ ملّت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۸۴، حصّہ اوّل، ص ۲۱۹

۳۶؎ ایضاً، ص ۷۹

امام ابن تیمیہؒ (م ۱۳۲۸ء) جیسی عظیم المرتبت علمی و دینی شخصیت کا تعلق عہدِ مملوک ہی سے تھا۔

۳۷؎ صحیح مسلم، باب: قطع السارق الشریف، مزید دیکھیں، صحیح بخاری، کتاب الحدود، عن عائشہؓ

کوئی ایسا واقعہ پیش کر سکتے ہیں کہ کسی جمہوری ملک کے فرماں روا نے اپنے اہلِ خاندان کو ان کے کسی جرم پر خود اپنے ہاتھوں سزا دی ہو یا پیش قدمی کر کے عدالت سے سزا دلوائی ہو؟

ابھی تک جمہوریت کی نظری خامیوں سے بحث کی گئی ہے اور اس کے بالمقابل اسلامی نظام حکومت کے نظری اور عملی پہلوؤں کو پیش کر کے دکھایا گیا ہے کہ اس کے اصول اور قاعدے زیادہ عمدہ اور عدل پر مبنی ہیں۔ اب آگے جمہوریت کے عملی نقائص پر گفتگو ہوگی اور اس کے بعد اسلام کے شورائی نظام کے عملی طریقوں کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔

عملی اعتبار سے جمہوریت کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں حکومت کی تشکیل براہِ راست عوام کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جن ملکوں بالخصوص ایشیاء اور افریقہ کے عوام کی اکثریت ناخواندہ ہے، ان سے اس بات کی توقع رکھنا کہ وہ سیاسی بیداری کا ثبوت دیں گے اور ان ہی افراد کو منتخب کریں گے جو سیاسی فہم اور قانون سازی کی صلاحیت رکھتے ہوں، نادانی کی بات ہوگی۔ اور یہ بات ان ملکوں کے جمہوری تجربوں سے بالکل واضح ہے۔

دوسرا عملی نقص یہ ہے کہ عوام انتخاب کے ذریعے اپنے جو نمایندے چنتے ہیں ان کے لیے کسی طرح کی علمی قابلیت اور سیرت کی خوبی لازمی نہیں ہے۔ ہر شخص خواہ وہ بالکل ناخواندہ ہو، عوام کا نمایندہ بن سکتا ہے، حتّٰی کہ خراب سیرت کے لوگ بھی اکثر اوقات مجلسِ قانون ساز کے رکن منتخب ہو جاتے ہیں۔

یہ طرفہ تماشا نہیں تو کیا ہے کہ حکومت کے مختلف مناصب پر تقرّر کے لیے ایک خاص لیاقت ضروری ہے، اس کے بغیر کسی عہدہ کا حصول ناممکن ہے۔ لیکن سیاست ایک ایسا شعبہ ہے جس کے لیے کوئی لیاقت مطلوب نہیں ہے، حالاں کہ یہ شعبہ حکومت کے دوسرے تمام شعبوں کے لیے مثل دماغ کے ہے۔ اگر اس شعبہ میں صاحبِ علم افراد نہ ہوں تو حکومت کے دوسرے شعبوں کی کارکردگی کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ یہی وہ شعبہ ہے جو مجلسِ آئین ساز کی شکل میں قوانین وضع کرتا ہے اور مجلسِ عاملہ کی شکل میں ان کو نافذ کرتا ہے۔ کام کی یہ نوعیت خود بتاتی ہے کہ اس شعبہ میں کس قسم کے افراد کی ضرورت ہے۔ ماہرینِ علمِ سیاست کا یہ متفقہ خیال ہے کہ کوئی جمہوری حکومت صرف اسی صورت

۳۸ عمرو بن العاص کے بیٹے نے قبطی کو تازیانے مارتے ہوئے کہا تھا ''لے یہ کوڑے، میں شریفوں کا بیٹا ہوں۔''

۳۹ عمر بن الخطاب، علامہ طنطاوی، مترجم عبدالصمد صارم، مطبوعہ البیان لاہور، ۱۹۷۱، ص ۱۸۷

۴۰ ایضاً، مزید دیکھیں، الفاروق، حصّہ دوم، ص ۴۰۹، ۴۱۰، عمر فاروق اعظم، محمد حسین ہیکل، ص ۵۹۵

۴۱ عمر بن الخطاب، علامہ طنطاوی، ص ۲۵۴، مزید دیکھیں، کتاب الاموال، ابو عبید، ص ۳۰

۴۲ الفاروق، حصہ دوم، ص ۳۷۵

میں کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے جب اسے دور اندیش اور بیدار مغز قیادت میسّر ہو۔

جمہوریت کے مذکورہ نقص ہی کی وجہ سے افلاطون (۴۲۸۔۳۴۸ ق م) نے اپنی کتاب ریاست (The Republic) میں لکھا ہے:

''جمہوریت محض نراج کا نام ہے، اس میں بناوٹ اور تصنّع کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے شہری خود غرضی اور مکّاری میں ایسے ڈوبے ہوتے ہیں کہ کوئی کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ شہریوں میں فرقہ بندیاں نمودار ہوتی ہیں اور ہر فرقہ کا کوئی ایسا مکّار اور چال باز آدمی سردار بن جاتا ہے جسے اپنے اقتدار کے علاوہ کسی اور بات کی فکر نہیں ہوتی۔ آخر میں ایک وقت آتا ہے جب انھی فرقوں کے سرداروں میں سے ایک شہر کا مطلق العنان بادشاہ بن بیٹھتا ہے۔ اس شخص کی ہوس اور شہرت کی بے لگامی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوتی ہے، دیکھنے میں وہ دوسروں کا بادشاہ، لیکن دراصل اپنی خواہشوں کا بے بس غلام ہوتا ہے، اور کوئی ایسی کمینی اور ظالمانہ حرکت نہیں ہوتی جو اس سے سرزد نہ ہو، اس لیے کہ اس کا دل عقل کی روشنی اور اخلاق کی رہبری سے محروم ہوتا ہے۔''[۴۴]

جمہوریت کا تیسرا عملی نقص اس کا جماعتی طریقۂ انتخاب ہے۔ اس قاعدے کے مطابق وہی لوگ بحیثیت امیدوار کھڑے ہوتے ہیں جن کو کوئی سیاسی جماعت اپنا امیدوار بناتی ہے۔ اور جماعت ان ہی لوگوں کو اپنا امیدوار بناتی ہے جو جماعت کے قائد کے فرماں بردار ہوتے ہیں یا کسی ایسے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے مفادات کی یہ جماعت نگراں اور محافظ ہوتی ہے۔ اس طرح ہر سیاسی جماعت ملک وقوم کے مفاد کو پیش نظر رکھنے کے بجائے جماعتی یا شخصی مفادات کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ملکی سیاست میں جماعتی اور شخصی مفادات کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔

اس سے بھی بڑا نقصان یہ ہے کہ سماج کے بہت سے افراد علم و تجربہ اور کردار کی خوبیاں رکھنے کے باوجود محض سرمایہ کی قلّت اور کسی سیاسی جماعت یا بڑی سیاسی شخصیت سے وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکی سیاست سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ملک باصلاحیت اور صاحبِ کردار افراد سے محروم ہو جاتا ہے اور ملک کی زمامِ اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتی ہے جو نااہل ہی نہیں ہوتے بلکہ پرلے درجے کے خود غرض اور مفاد پرست ہوتے ہیں۔ اور بالآخر ایسے بدقماش لوگوں کے ہاتھوں ملک تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

جمہوریت کا چوتھا عملی نقص یہ ہے کہ اس میں انتخاب کا عمل مسرفانہ ہے۔ اس کا ایک نقصان تو یہ ہے کہ ملک کی

۴۴؎ تفصیل کے لیے دیکھیں، عمر فاروق اعظم، محمد حسین ہیکل، ص ۵۹۴، ۵۹۵

دولت ضائع ہوتی ہے اور دوسرا نقصان جو زیادہ بڑا ہے، یہ ہے کہ انتخاب میں وہی لوگ حصّہ لے سکتے ہیں جو خود سرمایہ دار ہوں یا کسی سرمایہ دار یا سیاسی جماعت کی انھیں حمایت حاصل ہو۔ اس طرح دیکھیں تو درپردہ وہ لوگ حکومت چلاتے ہیں جو سرمایہ دار ہوتے ہیں، اور ان لوگوں کو اپنے صنعتی اور تجارتی مفادات کے علاوہ کسی دوسری بات سے مطلق دلچسپی نہیں ہوتی۔

جمہوریت کے برخلاف اسلام کا شورائی نظام ان سب خرابیوں سے پاک ہے۔ اس میں حکومت کی تشکیل تو انتخاب ہی کے ذریعے سے ہوگی لیکن درج ذیل شرائط کی پابندی لازمی ہے۔

(۱) انتخاب میں وہی لوگ حصہ لینے کے مجاز ہیں جو اس کے اہل ہوں (سورۂ نسآء: ۵۸)۔ حضرت ابوذر غفاری سے روایت ہے کہ:

میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے حکومت کے کسی عہدے پر مامور کیا جائے۔ آپ نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمایا، ابوذر، یہ ایک بھاری امانت ہے اور تم ایک کم زور آدمی ہو۔ قیامت کے دن یہ امانت باعث رسوائی ہوگی، مگر اس کے لیے نہیں جو اس کو حق کے ساتھ اٹھائے اور اس کی ذمہ داریوں کو کماحقّہ ادا کرے[۴۵]۔''

اسی تعلیم کا اثر تھا کہ خلیفۂ دوم نے منصبِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد فرمایا:

''اگر میں جانتا کہ کوئی دوسرا مجھ سے زیادہ امورِ خلافت کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس صورت میں منصبِ خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے کے مقابلے میں میرا قتل کیا جانا میرے لیے زیادہ راحت کا باعث ہوتا[۴۶]۔''

قرآن میں اہلیت کا جو معیار مقرر کیا گیا ہے وہ ''علم و جسم[۴۷]'' اور تقویٰ ہے۔

(۲) کوئی شخص خود کسی عہدہ کا خواہش مند نہ ہو لیکن اگر کوئی ذمہ داری اس کو دی جائے تو قبول کرلے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

انا، واللّٰہ، لانولی علی ھذا العمل احداً سائله ولا احداً حرص علیه[۴۸]۔	''خدا کی قسم، میں کسی ایسے آدمی کو انتظام حکومت میں کوئی عہدہ نہ دوں گا جو اس کا خواستگار ہو اور اس کی حرص رکھتا ہو۔''

عہدہ طلب نہ کرنے کی وجہ بھی آپ نے بتادی ہے۔ عبدالرحمٰن بن سمرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے مجھ سے فرمایا:

۴۴؎ تاریخ فلسفۂ سیاسیات، محمد مجیب، ص ۳۱

یا عبد الرحمن، لا تسأل الامارة، فانك ان اعطیتها عن مسئلة وکلت الیها وان اعطیتها عن غیر مسئلة اعنت علیها.[49]

''اے عبدالرحمٰن، امارت طلب نہ کرو، کیوں کہ اگر وہ تمھیں طلب کرنے پر ملی تو تمھیں اس کے حوالے کر دیا جائے گا اور اگر بغیر مانگے مل گئی تو اللہ کی طرف سے اس کام میں تمھاری مدد کی جائے گی۔''

اس سلسلے میں ایک دوسری روایت بھی قابلِ ذکر ہے جس میں امارت سے متعلق ایک استفسار کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اے ابوبکر وہ اس کے لیے ہے جو اس سے بے رغبت ہو، نہ کہ اس کے لیے جو اس پر ٹوٹا پڑتا ہو، وہ اس کے لیے ہے جو اس سے بچنے کی کوشش کرے، نہ کہ اس کے لیے جو اس پر جھپٹے، وہ اس کے لیے ہے جس سے کہا جائے کہ یہ تیرا حق ہے، نہ کہ اس کے لیے جو خود کہے کہ یہ میرا حق ہے۔''[50]

عہدہ و منزلت کی طلب ایک فطری خواہش ہے اور اس سے وہی لوگ بے نیازی اختیار کر سکتے ہیں جن کے نفس پاکیزہ یعنی تقویٰ کے حامل ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے جب حضرت عمر کو خلیفہ نامزد کیا تو ان کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

''عمر پہلی چیز جس کی طرف سے میں تمھیں ہوشیار رہنے کی نصیحت کرتا ہوں وہ خود تمھارا نفس ہے۔ ہر نفس کی کچھ خواہش ہوتی ہے اور جب تم اس کی کوئی خواہش پوری کر دو گے تو وہ آگے بڑھ کر دوسری خواہش کے لیے مچلنے لگے گا۔ اور دیکھو اصحابِ رسول میں سے اس گروہ سے ہوشیار رہنا جن کے پیٹ پھول گئے ہیں، نگاہوں میں ہوس بس گئی ہے، اور ان میں سے ہر ایک کو اپنا ذاتی مفاد عزیز ہے...... اچھی طرح سمجھ لو کہ جب تک تم اللہ سے ڈرتے رہو گے، جب تک تمھاری روش درست رہے گی، یہ لوگ بھی تمھارے لیے سیدھے رہیں گے۔''[51]

(۳) انتخاب غیر جماعتی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست جسدِ واحد کی طرح ہے، اس لیے سیاسی اور مذہبی یا کسی اور بنیاد پر جماعت سازی کا مطلب اس کی ہیئتِ اجتماعی کو نقصان پہنچانا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام میں فرقہ بندی ممنوع ہے، خواہ یہ سیاسی ہو یا مذہبی۔ فرمایا ہے:

۴۵؎ صحیح مسلم، باب کراہۃ الامارۃ

۴۶؎ عمر بن الخطاب، طنطاوی، ص ۷۰

۴۷؎ علم و جسم (سورۂ بقرہ: ۲۴۷) سے مراد یہ ہے کہ قاید بدنی لحاظ سے توانا اور جری اور دماغی اعتبار سے قوی ہو یعنی معاملہ فہم اور دور اندیش۔ تقویٰ کا مفہوم بہت وسیع ہے لیکن اس کا کم سے کم مفہوم یہ ہے کہ وہ دیانت دار اور جاہ و مال سے بے نیاز ہو۔ افلاطون نے محافظینِ ریاست کے لیے چار صفتوں کا ہونا ضروری قرار دیا ہے، علم، شجاعت، عفّت اور عدل (دیکھیں، ریاست (ریپبلک)، مترجم ڈاکٹر ذاکر حسین، انجمن ترقی اردو دکن، ۱۹۳۲ء، ص ۲۲۶ تا ۲۴۱)

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا. (ال عمران:۱۰۵)

''(اے مسلمانو!) ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنھوں نے باہم تفرقہ اور اختلاف کیا۔''

اسلامی نظام حکومت میں مجلسِ شوریٰ ہی کو حزبِ اختلاف کی حیثیت حاصل ہے، اس کو پورا حق حاصل ہوگا کہ وہ غیر جانبدارانہ طور پر حکومت پر تنقید اور اس کا محاسبہ کرے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے ارکان کا انتخاب غیر جماعتی بنیاد پر ہو۔

(۴) امیر ریاست (صدر مملکت[۵۲]) کا انتخاب براہِ راست عوام کے بجائے اہل الرّائے کے ذریعے سے ہو اور یہ اہل الرّائے مجلس شوریٰ کے منتخب ارکان ہوں گے۔ ماضی میں اس کی کئی نظیریں موجود ہیں۔ خلیفۂ اوّل کا انتخاب سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار اور مہاجرین کے مشورہ سے ہوا، یہ لوگ اپنی قوم کے اہل الرّائے تھے اور سقیفہ بنی ساعدہ کی حیثیت مجلسِ شوریٰ کی تھی۔ اگرچہ خلیفۂ دوم کو نامزد کیا گیا تھا لیکن بعد میں بیعت عام کے ذریعہ جس میں مدینہ کے اہلِ الرائے شریک تھے، اس نامزدگی کی توثیق ہوئی۔ خلیفۂ سوم کی شہادت کے بعد بدقسمتی سے انتخابِ امیر کا طریقہ موقوف ہوگیا اور ملوکیت کا دور شروع ہوا۔

اس میں استثنائی حیثیت اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ (۷۱۷-۷۲۰) کی ہے۔ انھوں نے دوبارہ شورائی طریقۂ انتخاب کو اختیار کیا۔ سلیمان بن عبدالملک (۷۱۵-۷۱۷) نے ان کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا لیکن وہ اس تقرر سے راضی نہیں ہوئے اور اعلان فرمایا:

ایّها الناس، انّی ابتلیت بهذا الامر من غیر رائی منّی ولا طلبة ولا مشورة من المسلمین، وانی قد خلعت ما فی اعناقکم من بیعتی فاختاروا لانفسکم غیری.[۵۳]

''لوگو! مجھے میری رائے اور خواہش، نیز مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر حاکم بنا دیا گیا ہے۔ اس لیے میں تمھیں اپنی بیعت سے آزاد کرتا ہوں۔ اب تم میرے سوا جس کو چاہو اپنا امیر بنالو۔''

---

۴۸ صحیح مسلم و بخاری، مزید دیکھیں، ابوداؤد

۴۹ صحیح مسلم

۵۰ صبح الاعشیٰ، قَلَقْشندی، بحوالہ، اسلامی ریاست، مولانا مودودیؒ، لاہور ۱۹۶۷، ص ۳۷۷ (مولانا نے تصریح کر دی ہے کہ یہ اثر حدیث کی کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے)۔

۵۱ کتاب الخراج، امام ابو یوسفؒ، مترجم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، مکتبہ چراغ راہ کراچی، ص ۱۲۶

چنانچہ اس وقت جولوگ مسلمانوں کے اہل الرّ ائے تھے انھوں نے اپنی خوشی سے عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنا خلیفہ منتخب کرلیا۔ یہ اہل الرّ ائے دراصل اہلِ استنباط ہیں جن کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے:

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ. (سورۂ نسآء:۸۳)

''اگر وہ اس خبر کو رسول اور اپنے اولو الامر تک پہنچا دیتے تو ان میں جو اہلِ استنباط ہیں وہ (اس خبر کی اصلیت کو بآسانی) جان لیتے۔''

اس آیت سے اسلامی نظام حکومت میں اہل الرّ ائے کا مقام اور ان کا کارِ منصبی بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ حکومت سازی میں اہلِ استنباط کی رائے کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ عوام کا کام یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنا نمایندہ بنائیں جو ان کے درمیان اپنی معاملہ فہمی اور حسنِ سیرت کے لحاظ سے ممتاز ہوں۔ اور پھر یہ اخیارِ امّت اسلامی ریاست کے امیر کو منتخب کریں۔ یہی طریقہ مطابقِ عقل ہے اور تجربے اور مشاہدے سے بھی اس کی افادیت ثابت ہو چکی ہے۔[۵۴]

(۵) اہل الرّ ائے اور امیر دونوں کا انتخاب سادگی سے ہو۔ ہر امیدوار کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے حلقۂ انتخاب میں اپنا تعارف کرائے اور بتائے کہ اگر وہ منتخب ہو گیا تو عام لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کام کرے گا۔ اس مقصد کے لیے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے موجودہ ذرائع کا استعمال پہلے سے مقررہ ضوابط کے مطابق کیا جائے اور اس کا خرچ اسلامی ریاست برداشت کرے۔ آج کل جمہوری ملکوں میں الیکشن کے موقع پر جس طرح تعارف و تشہیر (campaigning) کے نام پر ہنگامہ آرائی ہوتی ہے اور مسرفانہ طریقے اختیار کیے جاتے ہیں وہ سب ممنوع ہوں۔ کسی امیدوار کو اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ خود کو منتخب کرانے کے لیے اپنی دولت کا بے جا استعمال کرے اور جدید تشہیری وسائل کے ذریعہ سے شور و ہنگامہ کر کے عام لوگوں کے امن وسکون اور کاروباری مشاغل میں خلل انداز ہو۔ جس طرح شخصی تعارف سیدھا اور براہ راست ہوتا ہے اسی طرح انتخابی تعارف بھی سیدھا اور آسان ہونا چاہیے، جیسا کہ اہلِ ایمان کو ہدایت کی گئی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا. (سورۂ احزاب:۷۰)

''اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کہو (یعنی داؤں پیچ سے کام نہ لو)۔''

گزشتہ صفحات میں جمہوریت اور اسلام کے نظامِ حکومت کا جو تقابلی تعارف پیش کیا گیا ہے اس سے بالکل واضح

۵۴؎ راقم کے خیال میں صدارتی نظام (presidential system) ہی مناسب ہے، یہ نظام مسلمانوں کے مزاج اور ان کی سیاسی اور مذہبی تاریخ سے مطابقت رکھتا ہے۔

ہو گیا کہ ان نظامات میں نہ صرف اصولی اختلاف ہے بلکہ ان کے لائحۂ عمل بھی مختلف ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمدّنی مسائل کا حل نہ جمہوریت میں ہے اور نہ ہی کسی اور سیاسی نظام میں، ان کا حل صرف اسلام کے شورائی نظام میں ہے جو خدا کے قانون (قرآن) اور مسلمانوں کے اہل الرّائے کے مشورہ پر مبنی ہے۔ قانونِ خداوندی اور مشاورت سے انحراف کا دوسرا نام آمریت اور استبدادی حکومت ہے۔ چوں کہ غیر مسلموں کے پاس جمہوریت کا کوئی موزوں متبادل نہیں ہے اس لیے جمہوری نظام ان کے لیے مفید ہے، لیکن مسلمانوں کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ ان کے پاس اسلام کا شورائی نظام موجود ہے جو جمہوریت سے بدرجہا فائق ہے۔ وہ ان نقائص سے جیسا کہ تفصیل سے بیان کیا گیا، بالکل خالی ہے جو جمہوری نظام میں پائے جاتے ہیں۔

۵۳؎ اسلامی نظریۂ سیاست، مولانا حیدر زماں صدیقی، ص ۳۰

۵۴؎ انتخابِ امیر کا معاملہ تمام تر لوگوں کی ذہنی اور اخلاقی حالت کے تابع ہے۔ اگر ایک طویل عرصہ کے بعد محسوس ہو کہ اسلامی ریاست کے زیادہ تر شہری تعلیم یافتہ اور سیرت و اخلاق کے لحاظ سے خوب تر ہو چکے ہیں تو امیر کا انتخاب براہِ راست عوام کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔

ریحان احمد یوسفی

بچہ اور ماں

موٹر سائیکل ایک بڑی خطرناک سواری ہے۔ یہ گاڑی کی طرح تیز رفتار ہوتی ہے مگر صرف دو پہیوں کی بنا پر اس کا توازن برقرار رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ موٹر سائیکل چلانے والے سے زیادہ اس کے پیچھے بیٹھی خواتین خطرے کی زد میں ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ موٹر سائیکل پر ایک طرف رخ کر کے بیٹھتی ہیں اور ہیلمٹ بھی نہیں پہنتیں۔ بعض اوقات خاتون کی گود میں کوئی شیر خوار بچہ بھی ہوتا ہے۔ خاتون ایک ہاتھ سے خود کو اور دوسرے ہاتھ سے اپنے معصوم بچے کو سنبھالتی ہے۔

سڑک پر جاتے ہوئے مجھے یہ منظر ہمیشہ اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اس لیے کہ ان تینوں میں سب سے زیادہ غیر محفوظ یہی بچہ ہوتا ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہی غیر محفوظ بچہ سب سے زیادہ بے فکر بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے باپ نے موٹر سائیکل کا اور اس کی ماں نے اس کا سارا بوجھ اپنے اوپر لے کر اسے ہر فکر سے آزاد کر رکھا ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جب یہ بچہ بڑا ہو گا تو اسے اپنے ماں باپ کی مہربانیوں کا احساس ہو گا اور وہ اپنی بساط کی حد تک ان کے احسانات کا جواب دینے کی کوشش کرے گا۔

اس منظر کو دیکھ کر ساتھ ہی مجھے یہ خیال بھی آتا ہے کہ تمام انسان ایک دوسری سواری پر بھی سوار ہیں۔ یہ زمین ہے جو بغیر پہیوں کے خلا میں معلق ہے اور موٹر سائیکل کی رفتار سے ہزاروں گنا زیادہ تیزی سے حرکت کر رہی ہے۔ مگر ایک تھامنے والا اس پر سوار انسانوں کو تھامے ہوئے ہے۔ لاکھوں برس سے یہ سواری اس طرح ہموار چلی جا رہی ہے کہ وہ نہ سواریوں کو جھٹکے دیتا اور نہ انھیں گرنے ہی دیتا ہے۔

مگر یہ انسان جو اخلاقی حس رکھتا ہے، ماں باپ کا حق پہچانتا ہے، اُس مہربان کی دیگر تمام نعمتوں کی طرح اِس نعمت سے بھی منہ پھیر لیتا ہے۔ وہ زمین کی اس سواری کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ اسے یہ کوئی احسان محسوس نہیں ہوتا۔ اسے

بتا بھی دیا جائے کہ وہ ستر ماؤں سے بڑھ کر تمھیں چاہتا ہے۔اس لیے تم پر لازم ہے کہ تم بھی ماں سے ستر گنا زیادہ اس سے محبت کرو۔اس کا شکر کرو۔مگر انسان اس کے لیے صبح وشام شکریے کے دو لفظ کہنا گوارا نہیں کرتا۔حالانکہ اس کا شکر یہ تو جان دے کر بھی ادا نہیں ہوسکتا۔

کتنا عجیب ہے وہ مہربان اور کتنا عجیب ہے یہ انسان۔

اصل خبر

یہ حادثے کے شکار ایک ہوائی جہاز کی تصویر تھی۔طیارے کا ملبہ اور ہلاک شدگان کی لاشیں جائے حادثہ پر بکھری پڑی تھیں۔آگ بجھانیوالا عملہ شاید کچھ جلدی آ گیا تھا۔اس لیے ان لاشوں کے جھلسنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔لیکن آگ بجھنے سے قبل ان کے لباس کے علاوہ سر کے بال اور اور جسم کی کھال کو بھی چٹ کر چکی تھی۔

یہ ایک بہت بھیانک تصویر تھی۔مگر اس تصویر میں ایک یاد دہانی بھی تھی۔یہ یاد دہانی جہنم کی اُس آگ کی تھی جو اللہ تعالیٰ نے مجرموں کے لیے تیار کر رکھی ہے۔سورہ معارج میں ہے کہ یہ وہ آگ ہے جس کی لپٹ ہی چمڑی ادھیڑ ڈالے گی۔وہ پکار پکار کر ان لوگوں کو بلائے گی جو حق کو نظر انداز کرتے اور مال کو جمع کرتے ہوں گے۔

عام طور پر جہاز میں آسودہ حال لوگ سفر کرتے ہیں۔عام لوگوں کے لیے مالداروں کے طبقے میں شامل ہونا زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔چنانچہ وہ حلال وحرام کی پرواہ کیے بغیر مال جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ مال اور اس سے ملنے والی راحتیں اور آسانیاں ان کی کھال کو موٹا کرنا شروع کر دیتی ہیں۔وہ بے حس ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔انہیں خدا یاد رہتا ہے اور نہ روز قیامت۔وہ ان سے بے نیاز ظلم وعدوان کی زندگی گزارتے رہتے ہیں۔یہاں تک کہ زندگی کا جہاز ایک روز اچانک بغیر کسی اطلاع کے زمیں بوس ہوجاتا ہے۔

پھر انسان رہ جاتا ہے اور وہ آگ جس کی پسندیدہ غذا یہ موٹی کھال ہوتی ہے۔اور آج تو سائنس نے یہ بتا دیا ہے کہ آگ کی جلن کا سارا عذاب صرف یہ کھال محسوس کرتی ہے۔اسی لیے جب جب یہ کھال جھلس جائے گی اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ پیدا کر دیں گے۔(النساء4:56)

قرآن نازل ہی اس لیے ہوا تھا کہ حرام کھا کر مال اکھٹا اور کھال کو موٹا کرنے والوں کو اس آگ کی خبر دیدے۔جب لوگ قرآن نہیں پڑھتے تو کوئی طیارہ گر جاتا ہے تا کہ یہ خبر اخبار میں آجائے۔مگر افسوس کہ لوگ اخبار

میں بھی سب کچھ پڑھتے ہیں، اصل خبر نہیں پڑھتے۔

گیلی لکڑیاں

ہوا، آگ، پانی اور مٹی زندگی کے بنیادی عناصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کیا ہے کہ کرہ ارض پر زندگی کے یہ تمام بنیادی عناصر کثرت سے موجود رہیں۔ تاہم ان عناصر میں سے آگ ایک ایسا عنصر ہے جو حرارت کی شکل میں تو سورج سے تمام جانداروں کو براہِ راست ملتا رہتا ہے، مگر آگ کی شکل میں یہ عام دستیاب نہیں ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے وہ ایندھن بافراط اس دھرتی پر رکھ دیا ہے جس سے انسان آگ حاصل کر سکتے ہیں۔

موجودہ دور میں قدرتی گیس آگ کے حصول کے لیے سب سے زیادہ سستے ایندھن کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ تاہم اس سے قبل انسانی تاریخ کے تمام عرصے میں آگ کے لیے ایندھن کے طور پر لکڑیاں ہی استعمال ہوتی رہی ہیں۔ ہزاروں سال تک انسان جنگلات اور درختوں سے لکڑیوں کو کاٹتے اور ان سے اپنے گھر اور چولہے گرم رکھتے رہے ہیں۔ آج بھی ان علاقوں میں جہاں گیس موجود نہیں یہی ایندھن آگ کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔

جن لوگوں نے لکڑی کو ایندھن کے طور پر استعمال ہوتے دیکھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ لکڑی پر پانی کا پڑنا اسے ایندھن کے طور پر استعمال کے قابل نہیں رہنے دیتا۔ لکڑی جتنی خشک ہوگی، اتنی ہی جلدی اور تیز آگ پیدا کرنے کا سبب بنے گی۔ لکڑی گیلی ہو جائے تو وہ جلتی نہیں۔ جل بھی جائے تو آگ کم اور دھواں زیادہ دیتی ہے۔

دورِ جدید کے مسلمانوں کی دینداری کا معاملہ بھی گیلی لکڑیوں سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کر رکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک گروہ اسلام کا علمبردار بن کر دنیا میں رہے۔ اسلام کے چمن میں مسلمانوں کی فصل درختوں کی شکل میں پیدا ہوتی رہے۔ یہ لوگ اپنے وجود کو ایندھن کی طرح جلا کر ہدایت کی روشنی برقرار رکھیں۔ مگر بدقسمتی سے آج کا مسلمان اپنا مقصدِ حیات بھول گیا ہے۔ اس نے اپنے وجود میں خواہشات اور تعصّبات کی نمی کو اس طرح جذب کر لیا ہے کہ اب وہ خدا کے کام کے لیے ایک گیلی لکڑی بن چکا ہے۔ اور ایسی لکڑی اول تو ایندھن کے طور پر استعمال ہونے کے قابل رہتی نہیں اور اگر کیا بھی جائے تو اس سے آگ کے بجائے دھواں نکلتا ہے۔

ایمان کی آگ، عمل صالح کی حرارت اور اخلاقِ حسنہ کی روشنی صرف اس وجود سے پھوٹتی ہے جس نے مفادات،

خواہشات اورتعصّبات کی ہرنمی سے خودکو پاک کرلیا ہو۔ یہ پاک وجود دنیا میں رہتا اوراس سے استفادہ کرتا ہے، مگر اسے اپنا مقصود نہیں بناتا۔ وہ خواہشات نفسانی کو اپنا معبود نہیں بناتا۔ وہ حیوانی جذبات کو زندگی کا محور نہیں بناتا۔ وہ مادی لذات کو زندگی کا مرکز نہیں بناتا۔

ایسا بندہ مومن دنیا کو سرائے سمجھ کر زندگی بسر کرتا ہے۔ دنیا کی رنگینیاں اسے اپنی جانب کھینچتی ہے، مگر وہ ان کے عارضی حسن کے لیے جنت کی ابدی بادشاہی کا نقصان اٹھانا گوارا نہیں کرتا۔ اس کے ہر لمحے، پیسے اور صلاحیت کا بہترین مصرف یہ ہوتا ہے کہ اس سے جنت حاصل کی جائے۔ ایسا شخص تارک الدنیا تو نہیں ہوتا۔ وہ شادی کرتا، گھر بناتا اور معاش کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ مگر وہ جانتا ہے کہ اسے حدود میں جینا ہے، ہوس میں نہیں۔ ضرورت میں جینا ہے خواہش میں نہیں۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ہی اس کے امتحان کا پرچہ ہے۔ یہ پرچہ اگر نہیں دیا تو آخرت کی کامیابی ممکن نہیں ہے۔ مگر وہ جانتا ہے کہ بہرحال یہ دنیا کمرۂ امتحان ہے، کمرۂ آرام نہیں۔ یہی یقین اسے خدا کے کام کے لیے خشک لکڑی بنا دیتا ہے۔

دوسری طرف جو لوگ آخرت کو مقصود کے مقام سے ہٹا دیں، وہ جتنی بھی دینداری اختیار کر لیں، ان کی دینداری سے آگ کے بجائے دھواں پیدا ہوتا ہے۔ وہ دھواں جس سے حرات پیدا ہوتی ہے نہ روشنی۔ یہ لوگ انفاق کرتے ہیں، مگر ریا کاری کے ساتھ، یہ لوگ عبادت کرتے ہیں، مگر غفلت کے ساتھ، یہ لوگ نصرت دین کے لیے اٹھتے ہیں، مگر تعصّبات کے ساتھ۔ ان کی تمام تر دینداری ان کی خواہشات اور جذبات کے تابع ہی ہوتی ہے۔

ایسی گیلی لکڑیاں دنیا میں ایندھن نہیں بن پاتیں۔ البتہ قیامت کے دن وہ ضرور ایندھن بنیں گی، مگر یہ ایندھن جہنم کا ہوگا۔ وہ جہنم جہاں انسان اور پتھر ایک ساتھ جلائے جائیں گے۔

نیا آدمی نئی قوم

’’آج دنیا بھر میں مسلمانوں کے خلاف ظلم ہو رہا ہے۔ یہود و ہنود، امریکہ روس، مغربی میڈیا سب اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مشغول ہیں۔ آپ دیکھیے کہ کشمیر سے بوسنیا اور فلسطین سے چیچنیا تک ہر جگہ مسلمان جبر کی زد میں ہیں۔ ساری دنیا کی طاقتیں مسلمانوں کی دشمن بنی ہوئی ہیں۔ ہر جگہ وہ ظلم کا شکار ہیں۔ اس کا تازہ ترین نمونہ افغانستان اور پھر عراق پر امریکہ کے مظالم ہیں۔‘‘

یہ صاحب بے تکان بول رہے تھے اور میں خاموشی سے بیٹھا سن رہا تھا۔ جب وہ بول چکے تو میں نے ان کی بارگاہ میں عرض کیا: کبھی آپ نے غور کیا کہ جتنے مظالم غیر مسلم کر رہے ہیں، مسلمان خود مسلمانوں کے ساتھ اس سے زیادہ ظلم کر رہے ہیں۔ ایران و عراق کی آٹھ سالہ جنگ آپ کے پڑوس میں لڑی گئی۔ قیام بنگلہ دیش کے وقت جان، مال اور آبرو کی بربادی کی داستانیں تاریخ کے خونی ورق پر آج بھی رقم ہیں۔ پھر یہ بتایئے کہ آپ کے جاگیر دارانہ نظام میں جان مال اور آبرو کے خلاف ہونے والا کون سا ظلم ہے جو نہیں ہوتا۔ چوری، رہزنی، ڈاکہ، زنا بالجبر اور قتل کی وارداتیں آپ کے شہروں کے معمولات میں شامل ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ آپ کے ہاں انسانوں کو زندگی گزارنے کی بنیادی انسانی ضروریات بھی میسر نہیں۔ صاف پانی، تعلیم، روزگار، علاج و معالجہ اور انصاف جیسی چیزیں جو معاشرے کے لیے ناگزیر ہیں، آپ کے ہاں ایک غریب آدمی کی پہنچ سے باہر ہیں۔ آپ غریب ہیں تو اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم نہیں دلا سکتے۔ سفارش نہیں ہے تو ملازمت نہیں مل سکتی۔ کوئی بڑی بیماری ہو جائے تو مرنے والا تو مرتا ہے مگر پورے خاندان کا دیوالیہ کرا دیتا ہے۔ کوئی پوچھنے نہیں آتا۔ آپ پر اگر کوئی ظلم ہو جائے تو پولیس کا تصور ہی دہشت زدہ کر دیتا ہے۔ برسوں کچہری عدالت کے چکر لگا کر بھی انصاف نہیں مل پاتا۔ پھر ان سب کے ساتھ رشوت، ملاوٹ، کرپشن اور ان جیسے کتنے ہی مسائل ہیں جنہوں نے ایک عام آدمی کی زندگی کو مسائل کا جہنم بنا رکھا ہے۔

اگر آپ ایک کیلکو لیٹر اٹھائیں اور مسلمانوں کے مسائل کو شمار کرنا شروع کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جو مسائل و مصائب ہم غیر مسلموں کے ہاتھوں جھیل رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ مسائل وہ ہیں جو آج مسلمانوں نے خود اپنے لوگوں کے لیے پیدا کر رکھے ہیں۔

انھوں نے میری بات پوری نہیں ہونے دی اور کہنے لگے۔ یہ سارے مسائل جو تم نے گنوائے ہیں دراصل امریکی اور مغربی سازشوں کا نتیجہ ہیں۔ امریکہ اور اس کے حواریوں کا صرف ایک علاج ہے۔ ان کے خلاف جہاد ہونا چاہیے۔ جب امریکہ کا ناپاک وجود مٹ جائے گا تو ہمارے سارے مسائل بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔

میں نے ان سے کہا کہ پہلے دنیا بھر کے مسلمانوں پر برطانیہ مسلط تھا۔ اس کے خاتمے کے بعد بھی ہمارے مسائل ایسے ہی رہے۔ پھر سوویت یونین مسلط ہوا۔ اس کے خاتمے کے بعد بھی ہمارے مسائل ایسے ہی رہے۔ اب اگر امریکہ بھی ختم ہو جاتا ہے تو ہمارے مسائل پھر بھی ختم نہیں ہوں گے۔

آپ سوچیے کہ آپ جن طاقتوں کی بات کر رہے ہیں اگر وہ ظلم کر بھی رہی ہیں تو تنہا آپ ان کا کچھ نہیں بگاڑ

سکتے۔ مجھے بتائیے کہ آپ امریکہ، روس، ہندوستان اور مغرب کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ جبکہ آپ اگر فیصلہ کر لیں کہ آپ اپنے معاشرے کی اصلاح کر لیں تو کم از کم اپنے ارد گرد آپ کئی درجے اعلیٰ سیرت و اخلاق کے لوگ پیدا کر سکتے ہیں جو نہ جانے کتنے بندگان خدا کی مشکلات دور کریں گے۔ کتنے معذوروں، بیواؤں، یتیموں، مسکینوں اور ضعیفوں کا سہارا بنیں گے۔ کتنے بیماروں کا علاج کرا کر ان کی زندگی بچائیں گے۔ کتنی بے آسرا لڑکیوں کی شادیاں کرا کر ان کا خاندان بسائیں گے۔ کتنے نوجوانوں کو تعلیم دلا کر ان کی زندگی سنواریں گے۔ کتنے لوگوں کو جنت کے راستے تک پہنچا دیں گے۔

ہمیں اپنی تعمیر کرنی ہے۔ یہ تعمیر نفرت اور تخریب کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ اٹھیے اور اپنے ارد گرد محبت پھیلانا شروع کیجیے۔ لوگوں کی اخلاقی تربیت کیجیے۔ انھیں اچھا انسان بنائیے۔ زندگی میں کم از کم ایک انسان کی زندگی میں اجالا کر دیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ پھر اس چراغ سے کتنے چراغ جلیں گے۔

وہ کچھ نہ بولے اور سر جھکا دیا۔ ایک نیا آدمی پیدا ہو گیا۔ ایک نئی قوم پیدا ہو گئی۔

عقیل احمد انجم

”دعا“

ایسے وقت جب تمام آسرے اور سہارے ختم ہو جائیں تو انسان اپنے مالک حقیقی کو پکارتا ہے۔ دعا کے معنی بھی ندا اور پکار کے ہیں۔ قرآن پاک میں دعا کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے:

اول، اللہ کا ذکر اور حمد و ثناء۔

دوم، اللہ سے حاجت طلب کرنا، مشکلات، مصائب و آلام اور آفات سے نجات کے لیے اللہ سے درخواست کرنا۔

اللہ تعالیٰ بار بار اپنے بندوں کو صرف اس سے دعا مانگنے کے لیے کہتا ہے:

اُدْعُونِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ. (سورۂ مومن: ۶۰) ”مجھے پکارو میں تمھاری دعا کو قبولیت بخشوں گا۔“

دعا کی فضیلت

ترمذی میں حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الدعا مغ العبادة. ”دعا عبادت کا مغز اور جوہر ہے۔“

ایک اور جگہ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

لیس شئی اکرم علی الله من الدعاء. ”اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی چیز دعا سے زیادہ قابل تکریم نہیں ہے۔“

قرآن میں دعا مانگنے کی کیفیت اس طرح بیان ہوئی ہے:

”اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے......اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ۔ یقیناً

اللہ کی رحمت نیک کردارلوگوں سے قریب ہے۔‘‘(الاعراف ۷:۵۵-۵۶)

سوم، خدا سے دعا کے ساتھ ساتھ انسان کو مناسب ذرائع و وسائل پیدا کرنے اور اُن سے استفادہ کرنے کا اہتمام بھی کرنا چاہیے اور پھر نتیجہ خدا پر چھوڑ دینا چاہیے۔

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے دریافت فرمایا کہ تمھاری سواری کہاں ہے؟ اُس نے کہا شہر سے باہر چھوڑ آیا ہوں اور اللہ کی ذات پر بھروسہ ہے کہ وہ محفوظ رہے گی۔آپ نے ارشاد فرمایا کہ جاؤ اور سواری کا گھٹنا باندھ کر آؤ۔اس کے بعد خدا سے اس کی حفاظت کی امید رکھو۔

چہارم، دعا میں ایسی چیز طلب نہیں کرنی چاہیے جس کا دعا مانگنے والا اہل نہیں ہے۔مثلاً انبیائے کرام جیسے انعامات، درجات اور مراتب مانگنا۔

دعا کن کاموں کی وجہ سے قبول نہیں ہوتی

۱۔حرام کاموں، خدا کی نافرمانی اور گناہوں میں خدا سے مدد طلب کرنا۔

۲۔حرام کی روزی اور حرام لباس مانگنا۔

حدیث میں آتا ہے:

’’انسان دور دراز کا سفر کرتا ہے پراگندہ حالت اور غبار آلود صورت میں طلب نہ کی گئی ہو جو گناہ یا قطع رحمی کا باعث ہو یا وہ جلد ہ نہ مچائے۔‘‘

۱۔اللہ تعالیٰ دنیا میں ہی بندے کو وہ کچھ عطا فرما دیتا ہے جس کی اس نے آرزو کی ہو اور دعا مانگی ہو۔

۲۔عدم قبولیت کی صورت میں اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو آخرت میں اُسے اچھا بدلہ دینے کے لیے محفوظ کر لیتا ہے۔

۳۔جس بھلائی کی بندے نے طلب کی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس بھلائی کے ہم پلہ کسی برائی یا تکلیف کو دعا مانگنے والے سے دور کر دیتا ہے۔

۴۔دعا کی ابتدا اللہ کی تعریف سے ہونی چاہیے۔انسان اللہ کی حمد و ثناء کرے۔اس کے اسمائے حسنیٰ کا ذکر کرے۔اور پھر دعا مانگے۔

۴۔عاجزی اور انکساری کے ساتھ ہاتھ اللہ کے سامنے پھیلائے۔
